www.struggle.pk
دنیا بھر کے محنت کشو ایک ہو جاؤ!
طبقاتی جدوجہد
انقلابی سوشلزم کا علمبردار!
شمارہ جولائی 2024ء
مسلسل اشاعت کے 42 سال

برطانوی انتخابات: لیبر پارٹی کی جیت یا ٹوری پارٹی کی شکست؟

زوال کا جبر

مرکزی دفتر

105 منگل مینشن سیکنڈ فلور رائل پارک لکشمی چوک لاہور

فون: 042-36316214 فیکس نمبر: 042-36365659 ای میل: strugglepakistan@gmail.com

THE STRUGGLE

ایڈیٹر رنگ الٰہی

قیمت: 100 روپے

یکجہتی قیمت: 500 روپے

سالانہ سبسکرپشن: 2000 روپے

کوئٹہ	طبقاتی جدوجہد آفس، گوردت سنگھ روڈ نزد گورنمنٹ سپیشل سکول کوئٹہ	0343-0400318
مستونگ	عبدالرحمٰن	0333-7793396
کراچی	حاتم خان لُنڈ	0337-6298801
حیدرآباد	PTUDC آفس نزد دہلی شیر مال ہاؤس، سول ہسپتال روڈ حیدرآباد	0311-3170038
میرپورخاص	پرشوتم، طبقاتی جدوجہد آفس نزد پرانا سول ہسپتال میرپورخاص	0333-3586031
ٹنڈوالٰہیار	محمد حسین، P.O خواجہ ولیج ڈسٹرکٹ ٹنڈوالٰہیار	0333-2884809
دادو	انور پنہور، سٹیشن روڈ بھان سید آباد	03003272023
عمرکوٹ	آزاد جھامن داس	0349-3566688
خیرپور	شرجیل شر، پوسٹ آفس ٹھری میرواہ، خیرپور میرس	03013544615
صادق آباد	قمرالزماں خاں 204/6C الحیات سٹریٹ غفور آباد	0308-7172677
رحیم یار خان	حیدر چغتائی—45 بانو بازار	0345-4761547
ملتان	ایڈووکیٹ ندیم پاشا، ضلع کچہری، ملتان	0333-6156680
راجن پور	ایڈووکیٹ عبدالرؤف لُنڈ، تحصیل کورٹس جام پور، ضلع راجن پور	0333-6186870
کوٹ ادو	مزدور کلب بمقابل GPO اقبال پارک	0300-2241860
ترنڈہ	آفس طبقاتی جدوجہد، لائبریری چوک، ترنڈہ سوائے خان	0345-8021007
ڈسکہ	ایاز ٹیپو ایڈووکیٹ، نیو جوڈیشل کمپلیکس ڈسکہ	0343-6000482
فیصل آباد	ایڈووکیٹ ادیبہ علی	0308-4931937
قصور	فیاض	0322-8753484
راولپنڈی	آفس نمبر 16-A تھرڈ فلور، تاج محل پلازہ، 6th روڈ، راولپنڈی	0333-5358516
فتح جنگ	عبدالخالق	0315-0599951
ہجیرہ	طبقاتی جدوجہد آفس، کالج چوک ہجیرہ	0342-5548850
مظفرآباد	طبقاتی جدوجہد آفس، لوئر پلیٹ نزد سنوکر پیلس	0345-9568584
راولاکوٹ	مرکزی سیکریٹریٹ سیکنڈ فلور گلف شاپنگ کمپلیکس	0333-5698841,03459568584
کوٹلی	یاسر پینٹ سٹور ہولاڑ پوسٹ آفس تحصیل سہنسہ ضلع کوٹلی	0345-3974154
باغ	محمد ایاز خان، ایم ڈی ایس روڈ	0345-5533174
مالاکنڈ	ایڈووکیٹ غفران احد، ڈسٹرکٹ بار بٹ خیلہ	0344-9897418
بنوں	ساجد ایوب: آفس طبقاتی جدوجہد جنوبی پشتونخوا ایل جی 30 یونیورسٹی پلازہ بنوں سٹی	03359067135
سوات	صاحبزادہ باچا، کالج کالونی سیدو شریف	0343-9618902

عالمی منظرنامہ:

تحریر: آصف رشید

پگھلتا سیارہ

تحریر: بابر پطرس

5 جولائی 1977ء

تحریر: الیاس خان

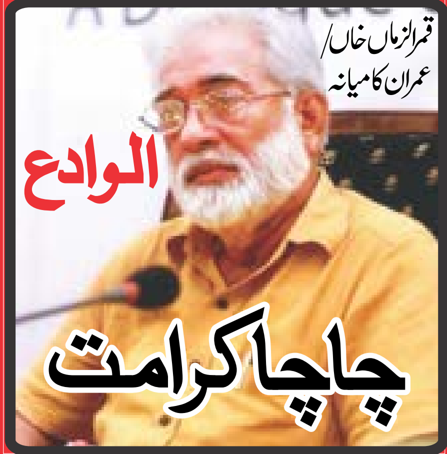

قمرالزماں خاں / عمران کامیانہ

الوداع

چاچا کرامت

یورپ میں رابطے کے لئے

BRITAIN
Naeem Khan
213 Billet Road London
E17 5NS
Britain

NETHERLANDS
Asif Alvi
Admiraal De Ruyter Weg-83 III 1057JZ
Amsterdam
Ph:0031-614454298

BELGIUM
Rana Sikander
Prekers Straat 8/1 2000
Antwerpen 1
Belguim
Ph:0032-497069406

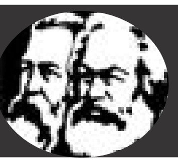

زوال کا جبر

انسانی سماج جب سے طبقات میں بٹا ہے' جبر کی ضرورت ہمیشہ موجود رہی ہے۔ یہ درست ہے کہ محنت کشوں کو محکومی پر مبنی نفسیات و نظریات کی غیر مرئی زنجیروں میں جکڑے رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن پھر ان پر خوف اور تشدد مسلط کیے بغیر بھی طبقاتی استحصال کو جاری نہیں رکھا جا سکتا۔ جس کا سب سے منظّم اور طاقتور ادارہ ریاست ہوتی ہے۔ تاریخ کے ہر طبقاتی نظام نے ریاست کو اپنی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق ڈھالا ہے۔ لیکن سرمایہ داری، جو طبقاتی سماج کی اعلیٰ اور ترقی یافتہ ترین شکل ہے، جہاں طبقاتی استحصال کو ایک نسبتاً پوشیدہ یا مخفی صورت دیتی ہے وہاں جبر و تشدد کے طریقوں میں بھی جدت لاتی ہے۔ مرحلہ واریت اور تدریج پرستی (Gradualism) پر مبنی اصلاح پسندی کے مکروہ فریبوں اور خوش فہمیوں کے برعکس ریاست چاہے آمریت اور بادشاہت وغیرہ پر مشتمل ہو یا اپنی جمہوری ترین شکلوں میں موجود ہو' آخری تجزیئے میں مسلح افراد کے جتھوں پر ہی مبنی ہوتی ہے۔ جس کا بنیادی مقصد سرمایہ داری کے وجود اور تسلط کو یقینی بنانا اور اس کے سماجی نظم و نسق کو قائم رکھنا ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے حکمران طبقات کی فہم و دانش، چاہے مذہبی ہو یا لبرل، عام لوگوں کے سامنے ریاستی ذمہ داریوں میں سے محض معاشرتی تنظیم اور نظم و نسق وغیرہ کے پہلوؤں کو ہی اجاگر کرتی ہے۔ بہر حال نظام میں کسی بھی طرح سے پڑنے والا خلل ریاستوں کے لئے مسئلہ ہوتا ہے۔ جسے دور کرنے کے لئے حکمران طبقات انہیں تشدد پر اجارہ دارانہ حقوق دیتے ہیں۔ جنہیں پھر وہ مسائل کی شدت اور نوعیت وغیرہ کے مطابق بوقت ضرورت بروئے کار لاتی ہیں۔ اس جبر و تشدد کا استعمال سرمایہ دارانہ ریاستیں داخلی طور پر اپنے ممالک میں بھی کرتی ہیں اور اپنی سامراجی شکلوں میں محکوم خطوں اور اقوام کے عوام پر بھی روا رکھتی ہیں۔ موخر الذکر صورت میں یہ بالعموم زیادہ عریاں اور وحشیانہ ہوتا ہے۔ مزید برآں تاریخ گواہ ہے کہ ریاستیں حکمران طبقات کے ایسے حصوں یا دھڑوں کو بھی کچلنے سے نہیں گھبراتی ہیں جو مخصوص حالات میں پورے نظام کے لئے خطرے کا باعث بننے لگتے ہیں۔

لیکن پھر ریاستی جبر کی شدت اور طریقوں وغیرہ کا انحصار خود اس نظام کی حالت یا کیفیت پر بھی ہوتا ہے جس کی کارگزاری یا دوام کو یقینی بنانے کے لئے اس کا استعمال کیا جا رہا ہوتا ہے۔ یہ ایک عام مغالطہ ہے جو پیٹی بورژوا انقلابی حلقوں میں سرایت کر کے مضحکہ خیز قسم کی سازشی تھیوریوں کو بھی جنم دیتا ہے کہ حکمران طبقات جبر کا استعمال شوق یا خواہش سے کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ ان کا اقتدار بغیر کسی انتشار اور مار ماری کے ایک 'پر امن' اور غیر محسوس طریقے سے چلتا رہے۔ نہ ہی انہیں مہنگائی اور بیروزگاری وغیرہ کی پالیسیاں نافذ کرتے ہوئے کوئی لذت ملتی ہے۔ نظام کی ایک تاریخی اٹھان اور سماجی و ثقافتی ترقی اور استحکام کی کیفیات میں ایسے اقدامات سے احتراز برتنا ان کے لئے کسی قدر ممکن بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ بڑھتی ہوئی سماجی دولت میں سے وہ عام لوگوں کو کچھ نہ کچھ دینے کے قابل ہوتے ہیں۔ ان حالات میں حاکم طبقات ایک اعتماد، رجائیت اور حوصلے سے سرشار ہوتے ہیں۔ وہ استحصال اور منافع خوری کی دور رس اور دیرپا منصوبہ بندی کو شارٹ ٹرم اور گھٹیا قسم کے منافعوں پر فوقیت دیتے ہیں۔ جبر کی ضرورت بھی کم ہو جاتی ہے اور ضرورت پڑنے پر بھی ریاستیں اس کے نسبتاً 'لطیف'، 'نفیس' اور خاموش طریقوں کا استعمال کرتی ہیں۔ جو زیادہ اذیت ناک اور گہرے ہو سکتے ہیں۔ لیکن بھونڈے نہیں ہوتے۔ مزید برآں اپنی برہنہ یا اعلانیہ شکل میں بھی یہ جبر اتنا ٹارگٹڈ، قطعی اور یقینی ہوتا ہے کہ باقیوں کے لئے عبرت ناک مثال قائم کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے نسبتاً امیر اور مستحکم ممالک (جن میں آمرانہ حکومتوں والے معاشرے بھی شامل ہیں) میں پولیس خال خال ہی نظر آتی ہے۔ لیکن امن عامہ کی صورتحال اور ریاستی رِٹ پاکستان جیسے ممالک سے کئی گنا بہتر ہے جہاں ناکے، چیک پوسٹیں، تلاشیاں، آپریشن اور ''ڈالے'' ایک معمول بن چکے ہیں۔

اگر ہم غور کریں تو مغربی دنیا کی 'مہذب' سرمایہ داری ترقی اور استحکام کے ایسے ہی حالات میں پروان چڑھی تھی۔ جن میں دوسری عالمی جنگ کی بے نظیر تباہ کاریوں کے بعد کی دہائیاں بہت اہمیت کی حامل تھیں۔ جب ایک تاریخی شرح منافع کے ساتھ سرمایہ دار ہوشربا منافع جات سمیٹنے کے قابل تھے۔ اسی دور میں بورژوا نقطہ نظر سے ہی سہی لیکن حقوقِ نسواں، جمہوریت اور سیکولرزم کی اقدار کو ایک نئی جلا ملی۔ ان ساری حاصلات میں محنت کش طبقے کی جدوجہد اور سوویت یونین کی موجودگی جیسے عوامل بھی یقیناً کارفرما تھے لیکن خود نظام کے اندر بھی گنجائش موجود تھی۔ لیکن 1980ء کی دہائی کے بعد سے سرمایہ داری کی زوال پذیری کیساتھ یہ سارا عمل اپنے الٹ میں بدلتا ہوا نظر آتا ہے۔ جس میں 2008ء کے بحران کے بعد ایک نئی جست لگی ہے۔

حالیہ سالوں میں سامراجی سرمایہ داری کے اپنے پالیسی ساز اس صورتحال کو تسلیم کر رہے ہیں اور فکر مند دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً رواں سال کے آغاز میں جان ہوپکنز یونیورسٹی کی ایک تحقیق کے مطابق امریکہ سمیت پوری دنیا میں جمہوری اقدار ایک گراوٹ کا شکار ہیں۔ جس میں اہم عنصر ایسے مطلق العنان رہنماؤں کے ابھار کا ہے جو مروجہ اداروں کو استعمال کرتے ہوئے اقتدار میں آتے ہیں اور جمہوری حقوق اور آزادیوں کو سلب کرتے جاتے ہیں۔ مزید برآں یہ صورتحال جہاں جمہوریت کے مکمل انہدام یا کھلی آمریت پر منتج نہیں ہوتی وہاں بھی جمہوری گورننس کے معیار کو بری طرح گرا دیتی ہے۔ اسی طرح سٹاک ہوم کے 'ادارہ برائے جمہوریت و انتخابی معاونت' (IDEA) کے مطابق دنیا کی آدھی جمہوریتیں (بشمول یورپ) زوال پذیری کی کیفیت میں ہیں جبکہ آمرانہ حکومتیں زیادہ سے زیادہ جبر پر اترتی جا رہی ہیں۔

یہ بنیادی طور پر ایک تاریخی متروکیت اور استرداد سے دوچار طرزِ پیداوار اور اس پر کھڑی معیشت کے سیاسی و سماجی مضمرات ہیں جو ترقی یافتہ ترین خطوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رہے ہیں۔ لیکن پاکستان جیسے بیشتر پسماندہ ممالک میں یہ بحران اتنا گہرا ہو چکا ہے کہ ایک طرف سماجی بے چینی، نفسا نفسی اور عدم استحکام کو نئی انتہاؤں پر لے جا رہا ہے۔ دوسری طرف یہ ساری کیفیت پھر ریاست میں سرایت کر کے اسے ایسے انتشار اور دھڑے بندیوں سے دوچار کر رہی ہے جس سے وہ زیادہ چڑچڑی اور وحشی ہوتی جا رہی ہے۔

اداریہ جدوجہد

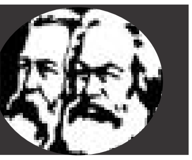

ملکی معیشت عملاً ایک دیوالیے کی کیفیت میں ہے۔ بحران اس قدر گہرا ہے کہ ایک مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کئی نئے اور پہلے سے زیادہ گھمبیر مسائل کو جنم دیتی ہے۔ ایک معاشی اشاریہ درست کرتے ہیں تو باقی بگڑ جاتے ہیں۔ میکرواکانومی کے خسارے کم کرنے کے چکر میں مائیکرواکانومی (عام آدمی کی معیشت) برباد ہو کے رہ گئی ہے جس نے نہ صرف مجموعی معاشی بحران کو مزید بھڑکا دیا ہے بلکہ ملک ایسے معاشرتی اضطراب سے دوچار ہو چکا ہے جو شاید ہی پہلے کبھی دیکھا گیا ہو۔ پچھلی ایک ڈیڑھ دہائی میں نظام کو ٹھیک کرنے کے تجربے ریاستی پالیسی سازوں کے لئے عذاب بن کے رہ گئے ہیں۔ اس بوکھلاہٹ کے عالم میں یہ مزید بربادیاں کرتے جا رہے ہیں۔ لیکن غور کریں تو ان کے پاس کچھ اچھا یا بہتر کرنے کی گنجائش بھی نہیں ہے۔

شہباز شریف کی مخلوط حکومت کو ملک کے اندر اور باہر کوئی سنجیدہ لینے کو تیار نہیں ہے۔ نہ معاشی پالیسی پر اس حکومت کا کوئی اختیار ہے‘ نہ سکیورٹی امور اور خارجہ پالیسی کے معاملات پر اس کا کوئی بس چلتا ہے۔ ان حالات میں جو بجٹ پیش کیا گیا ہے وہ آئی ایم ایف کے عوام دشمن نسخوں کے مجموعے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ معیشت کے جو حالات ہیں ان میں کوئی دوررس منصوبہ بندی ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ یہ قومی و صوبائی بجٹ بھی مہنگائی، نجکاری اور بیروزگاری وغیرہ کی شکل میں محنت کش عوام کی معاشی و سماجی ابتری کی عمومی سمت کا پتا ہی دیتے ہیں۔ 70 ہزار ارب روپے کا داخلی و بیرونی قرضہ ہے جو جی ڈی پی کے 80 فیصد سے تجاوز کر رہا ہے۔ جولائی کے مہینے کے آخر تک انہیں 10 ارب ڈالر بیرونی قرضے کی مد میں ادا کرنے ہیں۔ اگلے بارہ مہینوں میں 27 ارب ڈالر کی ادائیگیاں کرنی ہیں۔ جبکہ اگلے دو سے تین سالوں میں 70 ارب ڈالر سے زائد کے قرضے لوٹانے ہیں۔ دوسری طرف زرِ مبادلہ کے ذخائر مانگ تانگ کے بھی 9 ارب ڈالر نہیں بنتے۔

یہ صرف بیرونی قرضوں کا حال ہے۔ داخلی قرضے اس کے علاوہ ہیں۔ ریاست کی تقریباً تمام آمدن، جس میں سے 90 فیصد تک عام لوگوں پر بالواسطہ ٹیکس لگا کے جمع کیا جاتا ہے، قرضوں پر سود کی ادائیگیوں کی نذر ہو رہی ہے۔ جاری مالی سال میں یہ رقم 10 ہزار ارب روپے سے زائد بنتی ہے۔ صرف کچھ سال پہلے جی ڈی پی کا 4 فیصد اس مد میں خرچ ہو رہا تھا۔ اس وقت یہ شرح 8 فیصد سے تجاوز کر رہی ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ قرضے کم نہیں ہو رہے بلکہ انہیں موجودہ سطح پر برقرار رکھنے کے لئے بھی ادائیگیوں میں مسلسل اضافہ کرنا پڑ رہا ہے۔ جس کے لئے پھر اِن ڈائریکٹ ٹیکسوں کی بھرمار‘ بلکہ یلغار کی جا رہی ہے۔ آگ برساتی گرمی میں لوڈشیڈنگ کے ساتھ ساتھ بجلی کے بلوں میں مسلسل اضافہ جاری ہے۔ عوام کی آہ و بکا آسمان تک تو شاید پہنچ جائے لیکن طاقت کے ایوانوں میں کوئی اس پر کان دھرنے کو تیار نہیں ہے۔ ایک درجن سے زائد قسم کے ٹیکسوں اور واجبات کے ساتھ بجلی کے بل عملاً ریاستی بھتہ خوری کی پرچیاں بن چکے ہیں۔ لیکن اس مسلسل بڑھتے ٹیرف میں سے 60 فیصد تک پھر آئی پی پیز کو اس بجلی کی مد میں ادا کیا جا رہا ہے جو کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی۔ جاری مالی سال میں آئی پی پیز کو صرف پیداواری صلاحیت کی مد میں کی جانے والی ادائیگیوں (Capacity Payments) کا تخمینہ 2.8 ہزار ارب روپے کا ہے۔ بجلی کی اس قیمت کے ساتھ نہ یہاں چھوٹا کاروبار چل سکتا ہے‘ نہ صنعتکاری ہو سکتی ہے۔ لیکن صنعتی معیشت کی ترویج کا ارادہ تو پاکستانی بورژوازی اور ریاستی پالیسی ساز شاید ویسے بھی عرصہ قبل ترک چکے ہیں۔

کچھ ہفتے پہلے تک سرکاری حلقے ’افراطِ زر (مہنگائی) کے نیچے آنے پر شادیانے بجا رہے تھے۔ لیکن اب بجلی، گیس اور پٹرول سمیت اشیائے خورد و نوش کی قیمتوں میں اضافہ کیا جا رہا ہے اور آنے والے دنوں میں مزید کیا جائے گا۔ ابھی روپے کی قدر میں گراوٹ کا عنصران ٹیکسوں کے علاوہ ہے۔ اس سلسلے میں آئی ایم ایف کا شدید دباؤ موجود ہے اور امکان ہے کہ جاری مالی سال کے دوران ڈالر 330 روپے تک پہنچ جائے گا۔ یہ سارے اقدامات مزید مہنگائی، غربت اور تنگی کے نسخہ جات ہی ہیں۔

حالات اس نہج تک پہنچ چکے ہیں کہ مزید بیچنے کو کوئی خاص ریاستی اثاثے بچے نہیں ہیں۔ اب قرضوں کے حصول کے لئے پبلک پارک، شاہراہیں اور ایئرپورٹ گروی رکھے جا رہے ہیں۔ عدم استحکام اور غیر یقینی صورتحال کا یہ عالم ہے کہ جو ادارے نجکاری کی لوٹ سیل پر لگائے بھی جاتے ہیں ان میں کوئی غیر ملکی سرمایہ کار دلچسپی لینے کو تیار نہیں ہے۔ طفیلی اور بدعنوان ملکی بورژوازی کے جو دھڑے انہیں خریدنا چاہتے ہیں ان کا مطالبہ ہے کہ ادا کردہ قیمت کو سرکاری سرمایہ کاری کی مد میں دو یا تین گنا کر کے انہیں فوراً واپس لوٹا دیا جائے۔ یہ کوئی مبالغہ آرائی نہیں بلکہ پی آئی اے کے معاملے میں عارف حبیب نے باقاعدہ یہ مانگ کی ہے اور کے الیکٹرک میں اسی قسم کا ہیر پھیر تقریباً دو دہائیوں سے جاری ہے۔ بجلی کی باقی ڈسٹری بیوشن کمپنیوں کا بھی یہ حکمران بذریعہ نجکاری یہی حشر کرنا چاہتے ہیں۔

حکومت میں ہو کے حکومتی پالیسیوں پر جعلی قسم کی تنقید اور بدحال عوام سے ہمدردی کا گھٹیا ناٹک کرنے والی پیپلز پارٹی اور تحریک انصاف سمیت تمام مروجہ سیاست ظلم کی اس واردات میں ملوث ہے۔ عدالتی کارروائیوں اور متضاد فیصلوں کی اس قدر بھرمار ہے کہ یہ سارا سلسلہ ہی بے معنی ہو کے رہ گیا ہے۔ عدلیہ اور فوج ایسے ادارے ہوتے ہیں جنہیں بالعموم سیاست و معیشت سمیت دوسرے تمام ریاستی امور سے کوسوں دور رکھ کے سماج سے بالکل ماورا، ’نیوٹرل‘ اور مقدس قوتوں کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن پاکستانی سرمایہ داری کی ٹوٹ پھوٹ نے انہیں ملک کے متنازعہ ترین ادارے بنا ڈالا ہے۔ جن میں ریاست کی داخلی تقسیم سب سے واضح انداز سے اپنا اظہار کرتی ہے۔ ایسے میں اب ایک نئے آپریشن کا اعلان کر دیا گیا ہے جو تسلط، جبر، سنسرشپ اور زبان بندی کو نئی انتہاؤں پر لے جانے کا پیش خیمہ ہی ہے۔ ٹوئٹر پہلے ہی بند ہے لیکن اب باقی سوشل میڈیا پر بھی سخت قدغن لگانے اور واٹس ایپ سمیت ہر قسم کے ڈیجیٹل رابطوں کو زیادہ کڑی نگرانی میں لانے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ یہ بدتمیزی اور پاگل پن کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ لیکن کامریڈ لال خان کے بقول یہ حکمران پاگل ہوتے نہیں‘ ان کے نظام کا بحران انہیں پاگل کر دیتا ہے۔ پاکستان کو ایک ترقی یافتہ اور خوشحال ملک بنانے کا خواب تو ان حکمرانوں نے عرصہ قبل دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن آج یہ ایک وجودی بحران سے دوچار ہو چکے ہیں۔ ایسے میں ان کا جبر کسی ابھرتے ہوئے نظام کا جبر نہیں جس نے کوئی ترقی پسندانہ تاریخی فریضہ سرانجام دینا ہو۔ بلکہ ایک ایسے زوال پذیر نظام کا جبر ہے جس کا وجود محنت کشوں کی زندگیاں مزید اجیرن کرتے جانے سے مشروط ہے۔ لیکن ان کا خوف یہ بھی واضح کرتا ہے کہ معاشرے کی کوکھ میں طبقاتی بغاوت کے ایسے دھماکے کے حالات پک کر تیار ہو رہے ہیں جو ایک انقلابی قیادت میں ان کے متروک نظام کو اڑا کے رکھ دے گا۔

برطانوی انتخابات:

لیبر پارٹی کی جیت یا ٹوری پارٹی کی شکست؟

اِک اور دریا کا سامنا تھا مجھ کو...

عمران کامیانہ

توقعات کے مطابق برطانیہ کے عام انتخابات میں دائیں بازو کی کنزویٹو (ٹوری) پارٹی اپنی تاریخ کی بدترین شکست سے دوچار ہوئی ہے۔ پارلیمان میں 244 نشستوں کی کمی کیساتھ اسے صرف 121 نشستیں مل پائی ہیں۔ جبکہ مجموعی ووٹ میں اس کا حصہ تقریباً 43 فیصد سے 23 فیصد تک گر گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں لیبر پارٹی نے 209 کے اضافے کے کیساتھ 411 نشستیں اور (معمولی اضافے کیساتھ) 33 فیصد ووٹ حاصل کیے ہیں۔ ''سنٹرسٹ'' لبرل ڈیموکریٹس 72 نشستوں کے ساتھ تیسرے نمبر پر رہے ہیں (63 کا اضافہ)۔ اگرچہ مجموعی ووٹ میں ان حصہ محض 12 فیصد رہا۔ بہرحال 174 نشستوں کی بڑی اکثریت کیساتھ لیبر پارٹی بغیر کسی اتحادی کے حکومت بنانے کی پوزیشن میں آگئی ہے اور پارٹی رہنما کیئر سٹارمر برطانیہ کا نیا وزیراعظم منتخب ہو چکا ہے۔ ملکی تاریخ میں وہ لیبر پارٹی، جو 2010ء کے بعد پہلی بار اقتدار میں آئی ہے، سے تعلق رکھنے والا ساتواں وزیراعظم ہوگا۔

مذکورہ اعداد و شمار سمیت برطانوی انتخابات کے نتائج ہر حوالے سے لیبر پارٹی کی جیت سے زیادہ ٹوری پارٹی کی شکست اور گہرے بحران' بلکہ جزوی انہدام کی غمازی کرتے ہیں۔ ان انتخابات میں برطانوی عوام کی بڑی تعداد کا ایجنڈا کسی نہ کسی طرح ٹوری پارٹی کے اقتدار سے جان چھڑانا تھا۔ یوں لیبر پارٹی کو کسی امید سے زیادہ ٹوری پارٹی سے نفرت کا ووٹ پڑا ہے۔ جو اس کے گزشتہ 14 سالہ دورِ حکومت میں برطانوی عوام کی زندگیاں اجیرن اور بد سے بدتر کر دینے والی پالیسیوں کا نتیجہ ہے۔ اس وقت برطانوی عوام کی وسیع اکثریت کا خیال ہے کہ ان کے حالات 2010ء سے کہیں برے ہیں۔ چنانچہ ٹوری پارٹی ایسے حلقے بھی ہار گئی ہے جو تاریخی طور پر اس کا گڑھ رہے ہیں اور جہاں اسے کبھی شکست کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

برطانوی سرمایہ داری کے اپنے بحران کے تحت ٹوری پارٹی کا تقریباً ڈیڑھ دہائی کا اقتدار بھی مسلسل داخلی تقسیم، عدم استحکام اور غیر یقینی صورتحال کا شکار ہی رہا۔ اس دوران پانچ وزرائے اعظم تبدیل ہوئے (صرف 2016ء سے 2022ء تک کے عرصے میں چار) جن میں سے لزٹرس محض 50 دن ہی دفتر میں گزار سکی۔ جبکہ بورس جانسن اور رِشی سوناک جیسوں کو کوئی سنجیدہ لینے کو تیار نہیں تھا اور وہ حکمران سے زیادہ سوشل میڈیا کی طنزیہ میمز کا موضوع بن کے رہ گئے تھے۔

تاہم انتخابی نتائج اور ان سے جڑی غیر سرکاری رائے شماریوں (Opinion Polls) کا تھوڑا باریک بین تجزیہ برطانوی سیاست اور سماج سے متعلق اہم حقائق کو آشکار کرتا ہے۔ مثلاً ٹرن آؤٹ صرف 60 فیصد رہا جو 1885ء کے بعد کسی جنرل الیکشن میں برطانوی عوام کی دوسری سب

برطانوی انتخابات:

سے وسیع عدم دلچسپی کی غمازی کرتا ہے۔اس سے کم ٹرن آؤٹ (59 فیصد) 2001ء میں ہی سامنے آیا تھا۔ یوں بیشتر دوسرے ممالک کی طرح مروجہ سیاست سے لاتعلقی، بیزاری یا بے حسی برطانیہ کی سب سے بڑی ''پارٹی'' کے طور پر سامنے آئی ہے۔ اس صورتحال کی عکاسی انتخابی عمل سے پہلے کے رائے عامہ کے جائزے بھی کرتے ہیں۔ مثلاً جون 2024ء کے ایک سروے کے مطابق برطانوی حکومت اور سیاست پر لوگوں کا اعتماد 50 سال کی کم ترین سطح پر کھڑا ہے۔اس رائے شماری میں 79 فیصد لوگوں نے نظامِ سیاست وحکومت سے عدم اطمینان کا اظہار کیا۔ جبکہ 71 فیصد کا خیال تھا کہ یورپی یونین سے نکلنے (بریگزٹ) کے بعد حالات خراب ہی ہوئے ہیں (2019ء میں یہ شرح صرف 51 فیصد تھی)۔

انتخابی نتائج کا ایک اور اہم پہلو پارٹیوں کو ملنے والے ووٹوں اور سیٹوں کے درمیان تاریخ کی سب سے بڑی خلیج کا ہے جس نے انتخابی نظام پر سوالات کو جنم دیا ہے۔ مثلاً لیبر پارٹی کو 33 فیصد سے کچھ زیادہ ووٹوں کیساتھ 63 فیصد نشستیں ملی ہیں (یعنی ملنے والے مجموعی ووٹوں سے دگنی)۔ جبکہ انتہائی دائیں بازو کی ریفارم پارٹی کو 14 فیصد ووٹوں کے ساتھ صرف 1 فیصد نشستیں مل پائی ہیں۔اسی مظہر کا شکار لبرل ڈیموکریٹس اور گرین پارٹیاں بھی ہوئی ہیں۔ بی بی سی کے مطابق ووٹوں کے تناسب سے نشستوں پر مبنی ایک نظام کے تحت حالیہ انتخابات میں لیبر پارٹی کو 195، ٹوری پارٹی کو 156، ریفارم پارٹی کو 91 جبکہ گرین پارٹی کو 45 نشستیں ملتیں۔ لیکن چونکہ کسی حلقے میں ہارنے والی پارٹیوں کے ووٹ صفر سے ضرب کھا جاتے ہیں لہٰذا ایسا نہیں ہوسکا۔اس حوالے سے لیبر پارٹی کو پارلیمان میں حاصل ہونے والی نشستیں اسے ملنے والے ووٹ کی بہت مبالغہ آرائی پر مبنی عکاسی کرتی ہیں۔

بہرحال بائیں بازو کی گرین پارٹی اپنی تاریخ کی بہترین انتخابی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چار نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ لیکن دوسری طرف انتہائی دائیں بازو کی ریفارم پارٹی اپنا ووٹ تقریباً 2 فیصد سے بڑھا کر 14 فیصد تک لے گئی ہے اور (ووٹوں کی تعداد کے ساتھ عدم تناسب کے باوجود) پارلیمان میں چار نشستیں جیتنے میں کامیاب رہی ہے۔ جو کوئی خوشگوار پیش رفت نہیں ہے اور برطانوی محنت کشوں کے لئے ایک تنبیہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

لیکن کیئر سٹارمر کے تحت لیبر پارٹی کو ملنے والے ووٹ کا ایک اور حوالے سے بھی تقابلی جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ یہ بائیں بازو کے جیرمی کاربن کی قیادت میں 2017ء میں پارٹی کو ملنے والے ووٹ سے 7 فیصد کم ہیں! 2017ء میں جیرمی کاربن کے تحت لیبر پارٹی کو 40 فیصد ووٹ ملے تھے۔حتیٰ کہ 2019ء میں بھی کمی کے باوجود پارٹی نے تقریباً حالیہ انتخابات جتنے ووٹ ہی حاصل کیے تھے۔ اگرچہ مذکورہ دو انتخابات میں پارٹی کو بالترتیب 262 اور 202 نشستیں ہی مل پائی تھیں۔ یوں کارپوریٹ میڈیا اور لیبر پارٹی کے اندر و باہر کے دائیں بازو کی جانب سے کیئر سٹارمر کی قیادت میں پارٹی کی مقبولیت میں اضافے کا تاثر درست نہیں ہے۔ان حالات میں کیئر سٹارمر 1929ء کے بعد کم ترین ووٹوں سے منتخب ہونے والا وزیر اعظم ہوگا۔

ٹوری پارٹی کی شکست میں ایک اور اہم عنصر دائیں بازو کے ووٹوں کی تقسیم کا بھی ہے۔ 2019ء میں ٹوری پارٹی اور نائیجل فراج کی ریفارم پارٹی (اس وقت کی 'بریگزٹ پارٹی') ایک انتخابی الحاق میں تھے جس نے 14 ملین ووٹ حاصل کیے تھے۔ تاہم اس بار یہ ووٹ تقسیم کا شکار ہوا ہے۔ اس کے باوجود دونوں دائیں بازو کی پارٹیوں کے ووٹوں کو جمع کیا جائے تو وہ تقریباً 11 ملین بنتے ہیں جو لیبر پارٹی کے مجموعی ووٹ سے 1.2 ملین (12 لاکھ) زیادہ ہیں۔

تاہم جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ لیبر پارٹی کو ملنے والا تقریباً تمام ووٹ کسی امید اور رجائیت سے زیادہ ٹوری پارٹی سے بیزاری، یاس اور فرسٹریشن پر مبنی ہے۔ مثلاً جون میں ہی کیے جانے والے ایک اور سروے کے مطابق لیبر پارٹی کو ووٹ دینے کے خواہاں صرف 5 فیصد لوگ پارٹی کی پالیسیوں سے اتفاق رکھتے تھے۔ جبکہ 48 فیصد خالصتاً ٹوری پارٹی کو فارغ کرنے کے لئے اور باقی ایسی متفرق وجوہات کے تحت ایسا کر رہے تھے جو اسی نصب العین سے ملتی جلتی ہیں۔ حتیٰ کہ صرف 2 فیصد ''کمتر برائی'' کے نظریئے کے تحت لیبر کو ووٹ دے رہے تھے۔ فنانشل ٹائمز کے مطابق، ''لیبر پارٹی کے لئے لوگوں میں جوش و خروش کا فقدان حیران کن ہے۔ لیبر پارٹی کے حق میں ووٹ ڈالنے کا ارادہ رکھنے والے 2015ء، 2017ء اور 2019ء کی نسبت پارٹی کے ساتھ کہیں زیادہ غیر مربوط یا لاتعلق ہیں۔'' اسی طرح کے ایک اور سروے کے مطابق کل ووٹروں میں سے 71 فیصد کا خیال

Turnout

Leader	Keir Starmer	Rishi Sunak	Ed Davey
Party	Labour	Conservative	Liberal Democrats
Leader since	4 April 2020	24 October 2022	27 August 2020
Leader's seat	Holborn and St Pancras	Richmond and Northallerton	Kingston and Surbiton
Last election	202 seats, 32.1%	365 seats, 43.6%	11 seats, 11.6%
Seats won	411[a][b]	121	72
Seat change	▲ 209	▼ 244	▲ 61
Popular vote	9,704,655	6,827,311	3,519,199
Percentage	33.7%	23.7%	12.2%
Swing	▲ 1.6 pp	▼ 19.9 pp	▲ 0.6 pp

ان انتخابات میں برطانوی عوام کی بڑی تعداد کا ایجنڈا کسی نہ کسی طرح ٹوری پارٹی کے اقتدار سے جان چھڑانا تھا۔ یوں لیبر پارٹی کو کسی امید سے زیادہ ٹوری پارٹی سے نفرت کا ووٹ پڑا ہے۔ جو اس کے گزشتہ 14 سالہ دورِ حکومت میں برطانوی عوام کی زندگیاں اجیرن اور بد سے بدتر کر دینے والی پالیسیوں کا نتیجہ ہے۔

تھا کہ انتخابی مہم میں ان کے بنیادی مسائل پر کوئی خاص بات نہیں کی جا رہی ہے۔

انتخابی نتائج کا ایک اور اہم پہلو فلسطینی عوام کے حق میں آواز اٹھانے والے پانچ آزاد امیدواروں کی جیت بھی ہے۔ جن میں مسلمان پس منظر سے تعلق رکھنے والے چار افراد کے علاوہ لیبر پارٹی سے بے دخل ہونے والا جیرمی کاربن بھی شامل ہے۔ جس نے لیبر پارٹی کے امیدوار کو سات ہزار ووٹوں سے شکست دی۔

بہرحال لیبر پارٹی اب حکومت میں ہے اور سوال آگے کے حالات و واقعات کی پیش بینی کا ہے۔ اپنی وکٹری سپیچ میں سٹارمر کا زیادہ زور لیبر پارٹی کو ''تبدیل'' کرنے کی اپنی چار سالہ کوششوں اور ان کے نتیجے میں جنم لینے والی آج کی ایک ''مختلف لیبر پارٹی'' پر تھا۔ ''یہ الیکشن صرف ایک بدلی ہوئی لیبر پارٹی کے ذریعے ہی جیتا جا سکتا تھا۔'' بنیادی طور پر وہ جیرمی کاربن اور اس سے جڑے بائیں بازو کے رجحانات کی پارٹی سے بے دخلی یا سرکوبی کا حوالہ دے رہا تھا۔ کیئر سٹارمر کے حوالے سے کسی کو خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔ دائیں بازو کے اس نمائندے کا موازنہ باآسانی ٹونی بلیئر جیسے سامراجی گماشتے اور جنگی مجرم سے کیا جا سکتا ہے۔ 2020ء میں پارٹی قیادت سنبھالنے کے بعد سے وہ اپنے عزائم اور پالیسیاں کھل کے بیان کرتا آ رہا ہے۔ پچھلے مہینے پارٹی کے انتخابی منشور کی اشاعت کے وقت اس نے بالکل واضح کہا تھا کہ پارٹی کو ''کاروبار دوست'' ہونا چاہئے (واضح رہے کہ برطانیہ کی سب سے بڑی ٹریڈ یونین تنظیم 'یونائٹ' نے اس منشور پر احتجاج کرتے ہوئے انتخابات میں لیبر پارٹی کی حمایت نہیں کی ہے)۔ علاوہ ازیں سٹارمر نے سرمایہ داروں پر ٹیکس بڑھانے اور حکومت کی جانب سے فراہم کی جانے والی سماجی خدمات میں توسیع کو مسترد کیا تھا (''حکومت کے مالیاتی امور کو بے لگام نہیں چھوڑا جا سکتا'')۔ وہ اسرائیلی صیہونیت کا کھلا حمایتی ہے اور امیگریشن کو 'کنٹرول' کرنے کا عندیہ بھی دے چکا ہے۔ انہی وجوہات کی بنا پہ برطانوی سرمایہ داری کے وسیع حلقے بشمول کارپوریٹ میڈیا اس کے حمایتی اور پشت پناہ ہیں۔ ان میں سامراجی سرمایہ داری کے اہم جریدوں 'دی اکانومسٹ' اور 'فنانشل ٹائمز' کے لوگ بھی شامل ہیں۔ یہ کوئی حادثہ نہیں ہے کہ لیبر پارٹی کی اِس جیت کے بعد برطانوی سٹاک مارکیٹ نئی بلندیوں کو چھو رہی ہے۔ تاریخ بھی کیسے کیسے المیوں سے عبارت ہے!

لیکن سوال صرف سٹارمر کے موضوعی عزائم یا خواہشات کا نہیں بلکہ اس نظام کی معروضی حالت کا بھی ہے

اپنی وکٹری سپیچ میں سٹارمر کا زیادہ زور لیبر پارٹی کو ''تبدیل'' کرنے کی اپنی چار سالہ کوششوں اور ان کے نتیجے میں جنم لینے والی آج کی ایک ''مختلف لیبر پارٹی'' پر تھا۔ ''یہ الیکشن صرف ایک بدلی ہوئی لیبر پارٹی کے ذریعے ہی جیتا جا سکتا تھا۔'' بنیادی طور پر وہ جیرمی کاربن اور اس سے جڑے بائیں بازو کے رجحانات کی پارٹی سے بے دخلی یا سرکوبی کا حوالہ دے رہا تھا۔

جس کی بنیاد پہ اسے حکمرانی کرنا ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد برطانوی سرمایہ داری، جو کئی سو سال تک بیشتر دنیا پہ ایک فیصلہ کن سامراجی تسلط کی حامل رہی، مسلسل زوال پذیری کا شکار ہو کے امریکی سامراج کے مطیع کی حیثیت اختیار کرتی گئی ہے۔ 1980ء کی دہائی میں مارگریٹ تھیچر کا اقتدار گراوٹ کے اس سلسلے میں ایک اہم پیش رفت تھی جس نے اپنی نیولبرل پالیسیوں کی یلغار کیساتھ ایک زمانے کی انتہائی ترقی یافتہ اور دیوہیکل برطانوی صنعت اور کانکنی کی بنیادوں کو اڑا کے رکھ دیا۔ سرمائے کی شرح منافع میں گراوٹ کے ساتھ ریاستی سرمایہ داری کے زوال کے حالات میں برطانیہ کے اَپ سٹارٹ (نودولتی) سرمایہ داروں کی اس سیاسی رہنما نے اپنے طبقے کے شارٹ ٹرم منافعوں کے تقاضوں کے تحت ساری معیشت کو ایک 'رینٹیئر' طرز پر ڈھالا جو نجکاری کی دو نمبریوں اور سٹاک مارکیٹ، رئیل اسٹیٹ اور مالیات کے شعبوں کی سٹے بازی وغیرہ پہ مبنی تھی۔ جس میں وقت کے ساتھ خلیج، روس اور ہندوستان کے بدعنوان اور سیاہ سرمائے کی مداخلت بڑھتی گئی ہے۔ حالیہ سالوں میں چینی سرمایہ بھی وارد ہوا ہے۔ 2021ء میں برطانیہ میں رئیل اسٹیٹ کی بڑی لین دین میں سے 20 فیصد سے زائد میں چینی سرمایہ کار ملوث تھے۔

1981ء میں برطانیہ کے صرف دو فیصد حصص غیر ملکیوں کی ملکیت میں تھے۔ 2020ء تک یہ حصہ داری 56 فیصد سے تجاوز کر چکی تھی۔ اسی طرح یورپ میں امریکی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے کل اثاثوں میں سے نصف سے زائد صرف برطانیہ میں ہیں۔ برطانیہ میں امریکی کمپنیوں کے ملازمین کی تعداد جرمنی، فرانس، اٹلی، پرتگال اور سویڈن میں ان کے ملازمین کی مجموعی تعداد سے زیادہ ہے اور برطانیہ کا ایک چوتھائی جی ڈی پی ان کمپنیوں سے وابستہ ہے۔ یوں اچھے وقتوں کی قومی خود انحصاری، تفخر اور پروٹیکشنزم پر مبنی معاشی طرز پرزہ پرزہ ہو چکی ہے۔

2008ء کے بحران کے بعد معیشت کی حالت مزید پتلی ہی ہوئی ہے۔ جس کا اظہار برطانوی سیاست کے مسلسل انتشار اور عدم استحکام میں بھی ہوتا ہے۔ برطانوی معیشت کا تقریباً ہر بنیادی اشاریہ اس تاریخی بحران کی غمازی کرتا ہے۔ جیسا کہ مارکسی معیشت دان مائیکل رابرٹس نے اپنی ایک حالیہ تحریر میں واضح کیا ہے۔ محنت کی پیداواریت، جسے بورژوا معیشت اہم ترین معاشی اشاریوں میں شمار کرتی ہے، میں اضافے کے حوالے سے برطانیہ' سامراجی ممالک کی فہرست

برطانوی انتخابات:

میں آخری درجوں پر آتا ہے۔ حقیقی جی ڈی پی کی گروتھ 2008ء سے پہلے کے رجحان سے 20 فیصد نیچے ہے۔ اس وقت معیشت 65 سالوں کی کم ترین شرح نمو کا شکار ہے۔ بلکہ عملاً ایک ریسیشن یا سکڑاؤ سے دوچار ہے۔ فی کس جی ڈی پی کم و بیش 2007ء کی سطح پہ کھڑا ہے جبکہ محنت کشوں کی حقیقی اجرتیں اور قوت خرید 2007ء کی سطح سے بھی نیچے ہے۔ بالخصوص 2010ء میں ٹوری پارٹی کے اقتدار میں آنے کے بعد برطانوی عوام کا معیار زندگی ترقی یافتہ دنیا کے نچلے درجوں تک گرتا چلا گیا ہے۔ صرف پچھلے تین سالوں کے دوران بجلی اور گیس وغیرہ کے بلوں میں 60 فیصد جبکہ خوراک کی قیمتوں میں 30 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ نتیجتاً برطانیہ میں غربت کی شرح اس وقت پولینڈ سے بھی زیادہ ہے!

آمدن اور دولت کی ملکیت کی حوالے سے برطانیہ اس وقت ترقی یافتہ دنیا کے غیر مساوی یا ناہموار ترین ممالک میں سے ایک ہے (دوسرا نمبر)۔ جبکہ صرف 50 سال پہلے یہ مساوی ترین ترقی یافتہ ممالک میں شامل تھا۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس وقت 20 فیصد امیر ترین برطانوی شہریوں کے حصے میں ملک کی 36 فیصد آمدن اور 63 فیصد دولت آتی ہے۔ جبکہ آمدن اور دولت میں 20 فیصد غریب ترین شہریوں کا حصہ بالترتیب 8 فیصد اور 0.5 فیصد ہے۔ علاقائی حوالے سے بھی معیار زندگی اور اجرتوں میں تفاوت بہت وسیع ہے۔

2023ء میں تقریباً 43 لاکھ برطانوی بچے غربت کا شکار تھے۔ جو بچوں کی کل تعداد کا 30 فیصد بنتا ہے۔ جبکہ پچھلے ایک سال میں 30 لاکھ لوگوں کو بھوک مٹانے کے لئے فوڈ بینکوں (خیرات) کا رخ کرنا پڑا ہے۔

ہاؤسنگ کا بحران بھی شدید ہوتا جا رہا ہے۔ 1989ء کے بعد کے تیس سالوں میں پہلے کے تیس سالوں کی نسبت 30 لاکھ کم گھر تعمیر ہوئے ہیں۔ طلب اور رسد کے اس فرق کی وجہ سے لندن میں ایک اوسط گھر کی قیمت، جو 1997ء میں اوسط (سالانہ) آمدن سے 3.6 گنا تھی، 2023ء میں 12 گنا ہو چکی تھی۔ نتیجتاً پچھلے صرف دو سالوں میں بے گھری یا غیر انسانی حالات کی رہائش میں 60 فیصد اضافہ ہوا ہے۔

2010ء سے 2019ء تک آسٹریٹی کی پالیسیاں 190,000 زائد اموات پر منتج ہوئی ہیں۔ جبکہ ٹوری پارٹی کے برسر اقتدار آنے کے بعد اوسط عمر میں کوئی اضافہ نہیں ہو پایا ہے۔ بلکہ پسماندہ علاقوں میں لاکھوں لوگ دائمی بیماریوں کا شکار ہو کے پہلے کی نسبت جلدی مر رہے ہیں۔ اس سب کے پیچھے پھر ’این ایچ ایس‘ (قومی نظام صحت) کی زبوں حالی بھی کارفرما ہے۔ ایک وقت میں دنیا میں بہترین سمجھے جانے والے اس نظام صحت (جسے برطانوی عوام کو اعلیٰ ترین معیار کا علاج بالکل مفت فراہم کرنے کے لئے دوسری عالمی جنگ

کیئر سٹارمر کے حوالے سے کسی کو خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔ دائیں بازو کے اس نمائندے کا موازنہ با آسانی ٹونی بلیئر جیسے سامراجی گماشتے اور جنگی مجرم سے کیا جا سکتا ہے۔

کے بعد کی لیبر حکومت نے شروع کیا تھا) کو مسلسل نجکاری اور انڈر فنڈنگ کے ذریعے تباہی کے دہانے پہ پہنچا دیا گیا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق این ایچ ایس کا بجٹ شارٹ فال 12 ارب پاؤنڈ تک پہنچ چکا ہے۔ یہی حالات تعلیم کے شعبے کے ہیں یا بنتے جا رہے ہیں۔

جی ڈی پی میں سرمایہ کاری کا حصہ بھی 30 سال کی مسلسل گراوٹ کے ساتھ بیشتر ترقی یافتہ معیشتوں سے کم ہو چکا ہے۔ جس کے پیچھے پھر برطانوی سرمائے کی شرح منافع میں گراوٹ کا رجحان کارفرما ہے۔ یہ رجحان، جو سرمایہ داری کے نامیاتی بحران کی غمازی کرتا ہے، ناگزیر طور پر نجکاری اور آسٹیریٹی کی پالیسیوں کو مہمیز دیتا ہے۔ جن کے ذریعے منافع کما سکنے کی صلاحیت رکھنے والے سرکاری شعبے سرمایہ داروں کے حوالے کیے جاتے ہیں اور کارپوریٹ سرمائے کے ٹیکسوں کا بوجھ عوام پر منتقل کیا جاتا ہے۔ ایک تیسری صورت میں سرمایہ داروں پر ٹیکسوں کا بوجھ کم کرنے اور اپنے خسارے پورے کرنے کے لئے حکومتیں قرضے لیتی ہیں۔ لیکن اس عمل کی بھی حدود ہوتی ہیں۔ یہ قرضے سود سمیت لوٹانے ہوتے ہیں۔ ایک حد سے تجاوز کرنے کے بعد یہ حکومتی آمدن کو چاٹتے چلے جاتے ہیں (جیسا کہ سری لنکا یا پاکستان وغیرہ کے حالات ہیں)۔ یوں قرضوں کے ذریعے ایک وقت تک تو نظام کے بحران کو ٹالا جا سکتا ہے۔ لیکن آخر کار یہ بحران زیادہ بھیانک شکل میں اپنا اظہار کرتا ہے اور حکومتوں کو پہلے سے زیادہ جارحانہ کٹوتیوں کی روش اپنانی پڑتی ہے۔ مثلاً اس وقت برطانیہ کا ریاستی قرضہ، جی ڈی پی کے 100 فیصد سے تجاوز کر چکا ہے۔ خساروں اور قرضوں کی اس سطح پر دیوالیہ ہوتی جا رہی بلدیاتی حکومتوں کو چلانے، سرکاری شعبہ جات کے بجٹ شارٹ فال پورے کرنے اور زبوں حالی کا شکار انفراسٹرکچر (بشمول ہاؤسنگ) کی تعمیر و مرمت پر پیسہ لگانا بہت محال ہو جاتا ہے۔ شدید سماجی و معاشی بحران کے ان حالات میں نئی لیبر حکومت کو روزِ اول سے سنگین چیلنجوں کا سامنا ہو گا اور سٹارمر کے تحت ان سے نمٹنے کے لئے جو پالیسیاں اپنائی جائیں گی ان کی پیش بینی کرنا بھی کچھ محال نہیں ہے۔ منیر نیازی کے بقول

اِک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو۔۔
میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ حکومت بہت تیزی سے انتشار، عوامی نفرت اور ممکنہ طور پر کھلے غیض و غضب کا شکار ہو گی۔ ان حالات میں ریفارم پارٹی جیسے رجعتی رجحانات

برطانوی انتخابات:

بھی مزید مقبولیت حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن انقلابی بائیں بازو کے لئے بھی ناگزیر طور پر نئے امکانات کھلیں گے۔

مسئلہ یہ ہے کہ سوشل ڈیموکریسی تاریخی طور پر جن معاشی بنیادوں پر استوار ہوئی تھی سرمایہ داری کے بحران نے وہ کم و بیش منہدم کر ڈالی ہیں۔ شرح منافع کے بحران کے تحت ریاستوں کی آمدن اور معیشت میں حکومتی مداخلت کی گنجائش

برطانیہ کے محنت کش عوام کو بھی سٹارمر حکومت کی درسگاہ سے گزرنا ہوگا۔ جہاں بہت سے دوسرے اسباق کے ساتھ وہ یہ نتیجہ زیادہ ٹھوس انداز سے اخذ کرنے پر مجبور ہوں گے کہ ساری مروجہ سیاست اور نظام کا انقلابی متبادل تخلیق و تعمیر کیے بغیر نجات اور آسودگی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

گھٹتی چلی گئی ہے۔ جبکہ خسارے اور قرضے بڑھتے گئے ہیں۔ 1980ء کی دہائی میں سوویت یونین کے انہدام، مزدور تحریک کی زوال پذیری، مغربی سرمائے کی چین میں منتقلی اور نیولبرلزم کی یلغار جیسے عوامل نے پہلے ان پارٹیوں کو روایتی سوشل ڈیموکریٹک پروگراموں سے 'سنٹر لیفٹ' پہ منتقل کیا۔ لیکن 2008ء کے بعد سے یہ اس قدر دائیں طرف جھکتی گئی ہیں کہ روایتی دائیں بازو کے ساتھ گھل مل گئی ہیں اور دونوں رجحانات میں فرق کرنا محال ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں جیرمی کاربن کی ناکامی، پارٹی سے بے دخلی اور پھر پارٹی کے خلاف ہی انتخابات میں اترنا اپنے اندر اہم اسباق سمیٹے ہوئے ہے۔ لیکن اپنی لبرل اور 'سافٹ' شکلوں میں روایتی دایاں بازو خود ایک بحران کا شکار اور اپنی روایتی معاشی بنیادوں سے محروم نظر آتا ہے۔ ایسے میں ساری مروجہ یا روایتی سیاست دنیا بھر میں ایک عمومی استرداد کا شکار ہے۔ جس کے مضمرات میں مختلف شکلوں اور شدتوں کیساتھ انتہائی دائیں بازو کا ابھار بھی شامل ہے۔ جو ایک غیر روایتی اور ولگر انداز اور زیادہ ننگے و جارحانہ استحصالی طریقوں سے سرمایہ داری کے بحران کے حل کا پروگرام پیش کرتا ہے۔ جو کارگر نہ ہونے کے باوجود کسی انقلابی متبادل کے فقدان کے حالات میں مقبولیت حاصل کرتا ہے۔ لیکن پھر سیاسی افق کے بائیں طرف ایک وسیع خلا بھی پیدا ہوا ہے جسے بیشتر صورتوں میں بائیں بازو کے نئے اصلاح پسندانہ رجحانات نے بھرا ہے۔ اپنی ظاہری صورت اور لفاظی میں یہ رجحانات اگرچہ روایتی بائیں بازو سے کہیں زیادہ ریڈیکل معلوم ہوتے ہیں لیکن نظام کی حدود و قیود سے تجاوز نہ کر پانے کی وجہ سے بہت جلد ناکامی اور استرداد کا شکار ہو جاتے ہیں۔

یہ سارا عمل آگے بھی جاری رہے گا۔ جب تک کہ سرمایہ داری کو فیصلہ کن طور سے اکھاڑ پھینکا نہ جائے۔ لیکن تاریخی عوامل کی مدتیں انسانوں کی زندگیوں سے کہیں زیادہ طویل ہو سکتی ہیں۔ ایسے میں پیٹی بورژوا انقلابیت فرسٹریشن اور جلد بازی میں مضحکہ خیز حرکتیں، تجربے اور مہم جوئیاں کرنے پہ اتر آتی ہے۔ یا مایوسی میں مصالحت اور موقع پرستی کی دوسری انتہاؤں پہ چلی جاتی ہے۔ لیکن موجودہ حالات سے واضح ہوتا ہے کہ روایتی پارٹیوں کا وجود کوئی ازلی و ابدی حقیقت نہیں ہے۔ نہ ہی ان کی طرف رجحان یا ان کے اندر کام کوئی آفاقی اصول اور ناقابل تغیر طریقہ کار ہے۔ غیر معمولی تاریخی عوامل اور طبقاتی کشمکش کے ابھار کے وقتوں میں پارٹیاں بنتی ہیں، ابھرتی ہیں، مختلف تبدیلیوں سے گزرتی ہیں۔ لیکن پھر اپنی سماجی و معاشی بنیادیں کھو کر ایک استرداد اور انہدام کا شکار بھی ہو سکتی ہیں۔ لیکن پھر ان کی زوال پذیری کا عمل بھی مخصوص حالات میں طوالت اختیار کر سکتا ہے جس میں عبوری یا متضاد کیفیات بھی جنم لے سکتی ہیں۔ لیکن اس سارے پراسیس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ایسی کیفیات میں ان پارٹیوں سے چمٹے رہنا اور ماضی کو زبردستی حال پر منطبق کرتے رہنا بذات خود ایک حماقت بن جاتی ہے۔ بشرطیکہ مقصد انقلابی سیاست کے لبادے میں مادی مفادات کا حصول نہ ہو۔ کیونکہ اس صورت میں یہ کوئی حماقت نہیں بلکہ دانستہ طور پہ سرزد کیا گیا ناقابل معافی جرم ہوتا ہے۔

لیکن پھر مسئلہ یہ بھی نہیں ہے کہ کمی صرف ایک انقلابی نام والی الگ پارٹی کا اعلان کرنے کی ہے۔ جس کی گردان مسلسل کرتے رہنے سے محنت کش طبقے کی قیادت کا تاریخی بحران حل ہو جائے گا۔ ایک سنجیدہ جدوجہد سب سے پہلے سماج کے سنجیدہ اور حقیقت پسندانہ تجزیئے کی متقاضی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ایک انقلابی تنظیم یا پارٹی کو ہر اہم موڑ پر اپنی پوزیشنوں اور طریقہ ہائے کار پر نظر ثانی کرنی پڑتی ہے۔ جس کا آغاز بھی ماضی کی غلطیوں کو تسلیم کیے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ سب سے بڑھ کر تاریخ کا دھارا موڑ دینے کا نصب العین پہاڑوں سے بلند حوصلے اور چٹانوں سے کہیں زیادہ مضبوط صبر و تحمل کا تقاضا کرتا ہے۔ کیونکہ نہ تو تاریخی ارتقا کا کوئی بنا بنایا خاکہ موجود ہے' نہ انقلاب برپا کرنے کا کوئی ریڈی میڈ نسخہ اپنا وجود رکھتا ہے۔ ورنہ لینن اور ٹراٹسکی جیسے عظیم انقلابیوں کو بار بار اپنے تناظروں اور طریقوں کی اصلاح کی ضرورت پیش نہ آتی۔

اگر غور کریں تو بیشتر ترقی یافتہ دنیا کے حالات برطانیہ سے مختلف نہیں ہیں۔ اسی بحران کے ایک متضاد نتیجے کے طور پر فرانس کا فار رائٹ' اقتدار کی دہلیز پہ کھڑا ہے۔ ترقی پذیر یا پسماندہ ممالک میں حالات کہیں زیادہ بھیانک ہوتے جا رہے ہیں۔ کینیا میں حالیہ دنوں میں جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے وہ اسی سلسلے کی کڑی ہے جو تیونس اور مصر سے 2011ء میں شروع ہوا تھا اور اتار چڑھاؤ کیساتھ سری لنکا، لبنان اور سوڈان سمیت کئی ممالک سے ہوتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے۔ برطانیہ کے محنت کش عوام کو بھی سٹارمر حکومت کی درسگاہ سے گزرنا ہوگا۔ جہاں بہت سے دوسرے اسباق کے ساتھ وہ یہ نتیجہ زیادہ ٹھوس انداز سے اخذ کرنے پر مجبور ہوں گے کہ ساری مروجہ سیاست اور نظام کا انقلابی متبادل تخلیق و تعمیر کیے بغیر نجات اور آسودگی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

کینیا میں عوامی بغاوت

تحریر: انقلابی سوشلسٹ لیگ (کینیا)

ترجمہ: عمر عبداللہ

25 جون بروز منگل لاکھوں کی تعداد میں کینیا کی عوام فنانس بل 2024ء کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے۔ پارلیمنٹ پر دھاوا بول دیا اور اسے آگ لگا دی۔ ریاستی جبر کے نتیجے میں کم از کم 17 مظاہرین ہلاک اور 86 زخمی ہوئے جبکہ 20 لوگ اغوا کر کے غائب کر دیئے گئے۔

(کینیا میں گزشتہ کچھ ہفتوں کے دوران ریاست کی عوام دشمن معاشی پالیسیوں کے خلاف سماجی غم و غصہ ایک بڑی بغاوت کی صورت میں پھٹ پڑا ہے۔ تادمِ تحریر یہ احتجاج جاری ہیں جن کے نتیجے میں حکومت اپنے کچھ حالیہ استحصالی اقدامات واپس لینے پر مجبور ہوئی ہے۔ تاہم لوگ حکومت کے وعدوں پر یقین کرنے کو تیار نظر نہیں آتے ہیں۔ انقلابی سوشلسٹ لیگ (آر ایس ایل) کینیا کے کامریڈ ان احتجاجوں میں انقلابی پروگرام اور نعروں کے ساتھ بھرپور مداخلت کر رہے ہیں۔ ہم اپنے قارئین کے لیے آر ایس ایل کی جانب سے جاری کردہ مختصر رپورٹ اور اعلامیہ شائع کر رہے ہیں جو 25 اور 26 جون کو تحریر کیے گئے تھے۔)

ایک ہفتے تک لگاتار بڑے پیمانے کے احتجاج کے بعد 25 جون بروز منگل لاکھوں کی تعداد میں کینیا کی عوام فنانس بل 2024ء کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے۔ پارلیمنٹ پر دھاوا بول دیا اور اسے آگ لگا دی۔ ریاستی جبر کے نتیجے میں کم از کم 17 مظاہرین ہلاک اور 86 زخمی ہوئے جبکہ 20 لوگ اغوا کر کے غائب کر دیئے گئے۔

یہ بل نیولبرل پالیسیوں کی حامی صدر ولیم روتو نے آئی ایم ایف اور عالمی بینک کے ساتھ مل کر تیار کیا ہے۔ جو عوام کی اکثریت کے لیے ٹیکسوں میں نمایاں اضافہ کرے گا۔ پچھلے دنوں کے دوران احتجاج کی شدت میں شدید اضافہ ہوا ہے جس کا نتیجہ ملک گیر شٹ ڈاؤن کی صورت میں نکلا۔ یہ سماجی دھماکہ اس وقت ہوا جب پارلیمنٹ نے 106 کے مقابلے میں 195 ووٹوں سے بل کو عارضی طور پر منظور کیا۔

ووٹنگ کے بعد جب ہزاروں مظاہرین نے قانون ساز محل میں داخل ہو کر اسے آگ لگا دی تو اس کے ممبران چوہوں کی طرح زیر زمین سرنگوں کے ذریعے بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ پولیس نے ربڑ کی گولیوں اور آنسو گیس کے ساتھ ساتھ اصلی گولیاں بھی فائر کیں۔ جس کے نتیجہ میں ہونے والے جانی نقصان کا صحیح اندازہ ابھی تک نہیں لگایا جا سکا۔ اس کے علاوہ کم از کم 20 افراد ایسے ہیں جنہیں غائب کر دیا گیا ہے۔ ان میں مختلف سوشل میڈیا انفلوئنسر، صحافی اور ایک ڈاکٹر شامل ہیں۔ جن کا تاحال پتا نہیں لگایا جا سکا۔ انٹرنیٹ کنکشن کئی گھنٹوں کے لیے منقطع کر دیا گیا اور بعد ازاں بحال ہونے کے بعد بھی سروس انتہائی کمزور ہے۔ دوسری طرف ریاست کی طرف سے ٹیلی ویژن چینلوں کو بند کرنے کی دھمکی بھی دی گئی ہے۔

ملک بھر میں لاکھوں افراد نے ’’روتو کو جانا ہوگا‘‘ کے نعرے لگاتے ہوئے احتجاج کیا جبکہ ہزاروں نے ساحلی میں ’’روتو کے بغیر بھی سب کچھ ممکن ہے‘‘ کے نعرے لگائے۔ لاؤڈ اسپیکروں سے موسیقی بج رہی تھی۔ مظاہرین کینیا کے جھنڈے لہرا رہے تھے اور سیٹیاں بجا رہے تھے۔

فنانس بل کا مقصد ٹیکسوں میں مزید 2.7 ارب ڈالر کا

کینیا میں عوامی بغاوت

اضافہ کرنا ہے تا کہ بھاری قرض کے بوجھ کو کم کیا جا سکے۔ دوسری طرف صرف سود کی ادائیگیوں پر سالانہ آمدنی کا 37 فیصد خرچ ہو جاتا ہے۔ بہت سے لوگ اسے محنت کش طبقے کی معاشی حالت پر براہ راست حملہ کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ضروری اشیا اور خدمات پر نئے ٹیکس کم آمدنی والے گھرانوں کو بری طرح متاثر کریں گے۔ زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے درکار خرچے میں مزید اضافہ ہو گا جو حقیقی آمدن میں کمی کا باعث بنے گا۔ بہت سے کینیا کے لوگ پریشان ہیں کہ وہ خوراک، صحت اور تعلیم جیسی بنیادی ضروریات کیسے پوری کریں گے۔ زراعت سے لے کر تجارت تک مختلف شعبوں کے محنت کش ان ٹیکسوں کے اپنی آمدنی پر منفی اثرات کے بارے میں خدشات کا اظہار کر رہے ہیں۔ چھوٹے کاروباریوں کو خدشہ ہے کہ درآمدات اور دوسری اشیا پر زیادہ ٹیکس سے ان کے کاروبار کو نقصان پہنچے گا۔ نتیجتاً کاروبار ٹھپ ہو جائیں گے اور نوکریاں ختم ہوں گی۔

احتجاج آگے بھی جاری رہیں گے۔ 25 تاریخ کی رات جبر، ظلم اور غیر یقینی صورتحال کے ایک کشیدہ ماحول کے ساتھ ختم ہوئی۔ ہماری تنظیم (انقلابی سوشلسٹ لیگ) کے کئی ارکان زخمی ہیں اور ہمارے رہنماؤں کو بزدلانہ دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ اس کے باوجود ہم بہادر کینیا کے عوام، جو طویل عرصے سے سامراجی سرمایہ داری اور اس کے مقامی ایجنٹوں کے ظلم اور استحصال کو برداشت کرنے کے بعد سڑکوں پر نکل آئے ہیں، کے ساتھ مضبوطی سے تب تک کھڑے رہیں گے جب تک اس فنانس بل، روتو حکومت اور اس پورے ظالمانہ نظام کو حتمی شکست نہیں دے دیتے۔

انقلابی سوشلسٹ لیگ (کینیا) کا اعلامیہ

26 جون کو کینیا کے عوام نے ایک بہت اہم کامیابی حاصل کی ہے جسے نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ ایک ٹیلیوژن پیغام میں صدر ولیم روتو نے متحرک عوام کے سامنے 'سر تسلیم خم' کر لیا اور اعلان کیا کہ وہ 2024ء کے مالیاتی قانون پر دستخط نہیں کریں گے اور اسے واپس لے لیا جائے گا۔

یہ ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔ حکومت کے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے ساتھ مل کر تیار کردہ مالیاتی بل کے ذریعے ظالمانہ ٹیکسوں میں اضافہ کیا جا رہا ہے تا کہ قرض کی ادائیگی کے لیے فنڈز جمع کیے جا سکیں۔ یہ بل مزدوروں اور غریب عوام کو بہت بری طرح متاثر کرے گا۔

گزشتہ ہفتے کے دوران ملک بھر میں بڑے پیمانے پر مظاہروں کی شدت میں اضافہ ہوا اور 25 جون بروز منگل جب پارلیمنٹ نے اس بل کی منظوری دی تو یہ احتجاج ایک ملک گیر ہڑتال کی شکل اختیار کر گئے۔

ریاست نے بے رحمانہ جبر کا مظاہرہ کیا۔ یہاں تک کہ مظاہرین پر براہ راست گولیاں چلائیں جس سے کم از کم 23 افراد ہلاک ہو گئے اور متعدد سیاسی کارکنوں، صحافیوں اور سوشل میڈیا ایکٹوسٹوں کو اغوا کر لیا گیا۔ جن میں سے کم از کم 20 اب بھی لاپتہ ہیں۔ لیکن اس سب کے باوجود عوام پیچھے نہیں ہٹے اور بہادری سے اس جبر کا مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ پارلیمنٹ کی عمارت میں داخل ہو گئے۔ مظاہرین نے ان قانون سازوں کو زیر زمین سرنگوں کے ذریعے فرار ہونے پر مجبور کر دیا جنہوں نے ابھی ابھی اس قانون کے حق میں ووٹ دیا تھا۔

مظاہرے کی اگلی رات گتھورائی میں وسیع پیمانے پر گولیاں چلنے کے نتیجے میں سینکڑوں افراد کے قتل اور گرفتاریوں کی خبر نے احتجاج کی شدت میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔ میڈیا کی طرف سے اس واقعے کو دبانے کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں اور لوگوں نے پوری حکومت کے ہی مستعفی ہونے کا مطالبہ کر دیا۔

اسی رات صدر روتو نے سخت لائن لیتے ہوئے مظاہرین کو ''غدار'' قرار دیا اور مظاہرین کے خلاف آہنی ہاتھوں سے نمٹنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ انٹرنٹ سروس بند کر دی گئی اور ٹی وی چینلوں کو بھی بندش کی دھمکیاں دی جاتی رہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے پولیس کی مدد کے لیے فوج بھی طلب کر لی۔ لیکن اگلے ہی دن اس نے مظاہرین کے سامنے بغیر کسی ابہام کے اپنی شکست کو تسلیم کر لیا۔

ایک ٹیلیوژن پیغام میں صدر ولیم روتو نے متحرک عوام کے سامنے 'سر تسلیم خم کر لیا اور اعلان کیا کہ وہ 2024ء کے مالیاتی قانون پر دستخط نہیں کریں گے اور اسے واپس لے لیا جائے گا۔

روتو نے ایک ٹیلی وژن بیان میں کہا ''2024ء مالیاتی بل کے اجرا پر ہونے والی بحث پر غور کرنے اور کینیا کے عوام، جنہوں نے پرزور انداز میں اس بل کو رد کر دیا ہے، کو سننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس بل پر دستخط نہیں کروں گا اور یہ بل واپس لے لیا جائے گا۔''

انقلابی سوشلسٹ لیگ یہ ضروری سمجھتی ہے کہ اس فتح کو تسلیم کیا جائے تا کہ ایک بار پھر اس حقیقت کو اپنے دماغوں میں تازہ کیا جا سکے کہ آج بھی عوامی احتجاج مسائل کے حل کا سب سے موثر ذریعہ ہیں اور یہ کہ ہم عوام جب کسی مسئلے پر اکٹھے ہو جائیں تو ایک ناقابل تسخیر قوت بن جاتے ہیں۔

ساتھ ہی ساتھ ہم عوام کو تنبیہ کرتے ہیں کہ اس قانون کی موثر طریقے سے واپسی صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ ہم سڑکوں پر اپنا احتجاج جاری رکھیں۔ اگر صدر روتو اس بل پر دستخط نہیں کرتا لیکن بل واپس نہیں لیا جاتا تو منظوری کے 21 دنوں بعد یہ خود بخود قانون بن جائے گا۔ روتو پر ہمیں کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ اگر اس کے بیانات کے نتیجے میں لوگ احتجاج ختم کر دیتے ہیں اور ریاست کو پھر سے منظم ہونے کا وقت اور موقع مل جاتا ہے تو وہ اپنے وعدے سے مکرنے میں ہرگز دیر نہیں لگائے گا۔ لیکن اگر ہم احتجاج کو منظم کرنا جاری رکھتے ہیں تو نہ صرف اس عوام دشمن بل کی واپسی کو یقینی بنایا جا سکتا ہے بلکہ اس کامیابی سے ملنے والے اعتماد کو استعمال کر کے ان مطالبات سے آگے بھی بڑھا جا سکتا ہے۔

آر ایس ایل' کینیا کے عوام سے اپیل کرتی ہے کہ مالیاتی بل 2024ء کی مکمل واپسی، روتو کی پوری حکومت اور اس کی نافذ کردہ نیولبرل سامراجی پالیسیوں کے خاتمے اور اس بدترین جبر کے ذمہ دار افراد کو انجام تک پہنچانے کے لیے احتجاج جاری رکھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم تمام لوگوں کو ان مقامی سامراجی ایجنٹوں کے خلاف اپنے حقوق کی جدوجہد کو آگے بڑھانے کے لیے ایک متبادل پارٹی کی تعمیر کی بحث کے آغاز کی بھی دعوت دیتے ہیں۔

بھارتی انتخابات میں ہندوتوا گھائل

چارسو سے زائد سیٹوں کا خواب دیکھنے والی بی جے پی اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود بھی ان انتخابات میں سادہ اکثریت حاصل کرنے میں نہ صرف ناکام رہی ہے بلکہ گزشتہ چناؤ کی نسبت ان انتخابات میں مودی کو 63 نشستیں کم حاصل ہوئی ہیں جو بھارتی سماج میں اس کی مقبولیت میں گراوٹ کا کھلا اظہار ہے۔

تحریر: راہول

بھارت کے حالیہ عام انتخابات میں بظاہر ’فتح‘ کے بعد نریندر مودی ایک بار پھر بھارت کا وزیراعظم بننے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ تقریباً 65 فیصد ٹرن آؤٹ کے ساتھ 19 اپریل سے یکم جون تک جاری رہنے والے دنیا کے سب سے بڑے عام انتخابات میں مودی کی بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) اپنے (400 نشستوں کے) تمام تر اہداف اور پروپیگنڈے کے برعکس پارلیمنٹ کی 543 کُل نشستوں میں سے محض 240 ہی حاصل کر سکی ہے۔ بی جے پی کے انتخابی الائنس این ڈی اے کی حاصل کردہ نشستوں کو شامل کیا جائے تو لوک سبھا میں مودی کو کُل 293 نشستیں حاصل ہو سکی ہیں جو حکومت بنانے کے لیے درکار 272 سیٹوں کے ہدف کو پورا کرتی ہیں۔ تاہم اب مودی کو مخلوط حکومت کے ذریعے حکمرانی کرنا ہوگی۔

ایودھیا میں رام مندر کا قیام ہو یا پھر اقلیتوں کے خلاف نفرت انگیزی اور تشدد‘ میڈیا پر مودی سرکار کے گن گانے والے زرخرید اینکرز کا زہریلا پروپیگنڈا ہو یا پھر دیگر سیاسی جماعتوں کو یکساں مواقع کے ماحول سے محروم رکھنا‘ یہ تمام تر ہتھکنڈے بھی مودی کو لوک سبھا (پارلیمان) میں وہ اکثریت نہیں دلا سکے جس کی وہ خواہش کر رہا تھا۔ چار سو سے زائد سیٹوں کا خواب دیکھنے والی بی جے پی اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود بھی ان انتخابات میں سادہ اکثریت حاصل کرنے میں نہ صرف ناکام رہی ہے بلکہ گزشتہ چناؤ کی نسبت ان انتخابات میں مودی کو 63 نشستیں کم حاصل ہوئی ہیں جو بھارتی سماج میں اس کی مقبولیت میں گراوٹ کا کھلا اظہار ہے۔

بی جے پی کا گڑھ سمجھے جانے والی اور بھارت کے سب سے زیادہ تقریباً 80 پارلیمانی حلقے رکھنے والی ریاست اُتر پردیش میں بھی اُنہیں ایک طرح سے شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ یو پی کے بیشتر حلقوں میں یا تو بی جے پی اپنی روایتی جیتی ہوئی نشستیں ہاری ہے یا پھر اس کے امیدواروں کو انتہائی کم مارجن سے فتح نصیب ہوئی ہے۔ یاد رہے کہ یہ وہی ریاست ہے جہاں بی جے پی کو گزشتہ انتخابات میں 64 نشستیں حاصل ہوئی تھیں مگر اب یہ سیٹیں سکڑ کر 33 ہو چکی ہیں۔

اسی طرح جس نتیجے نے نریندر مودی اور اس کی جماعت کے ہوش اڑا کر رکھ دیئے وہ دراصل یو پی میں موجود فیض آباد کا حلقہ ہے جہاں انتخابات سے چند ہی روز پہلے رام مندر کا قیام عمل میں لایا گیا اور پورے بھارت

سے مشہور کاسہ لیس شخصیات کو اکٹھا کر کے مندر میں مورتی کی 'استھاپنا' کروائی گئی۔ اس ایونٹ کو میڈیا نے بھرپور کوریج دی اور ایک 'گیم چینجنگ' ایونٹ قرار دیا۔ مگر نہ صرف ایودھیا میں مودی کے ہندوتوا کے نظریے کو بری طرح شکست ہوئی بلکہ پوری ریاست اتر پردیش میں اس نفرت انگیز سیاست کو عوام نے مسترد کر دیا۔

یقیناً انتخابات میں اپنی اکثریت کھونے کے باوجود بھی نریندر مودی تیسری بار وزیر اعظم بن گیا ہے مگر اس بار بھارت پر حکمرانی کے لیے اسے اپنی اتحادی جماعتوں (تیلگو دیسم پارٹی اور جنتا دل یونائیٹڈ وغیرہ) پر زیادہ انحصار کرنا پڑے گا۔ اس سے قبل گزشتہ الیکشن میں جہاں این ڈی اے کی ٹوٹل سیٹیں 353 تھیں وہیں صرف بی جے پی نے 303 نشستیں اکیلے ہی حاصل کی تھیں۔ یہی سبب تھا کہ اپنے گزشتہ ادوار میں حکومتی فیصلہ سازی میں مودی کو کسی اتحادی جماعت سے نہ کسی مشاورت کی ضرورت تھی نہ ہی وہ جماعتیں اسے بلیک میل کرنے کی حیثیت رکھتی تھیں۔ مگر یہ اقتدار اس کے لیے کئی نئی مشکلات کو جنم دے سکتا ہے۔

اس صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے لبرل سرمایہ داری کے علمبردار جریدے دی اکانومسٹ نے اپنے تازہ شمارے میں لکھا کہ ''مودی کا تخت بے شک سپریم تھا مگر ہر راج کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اگر توقع کے مطابق بی جے پی اور اس کے اتحادی اگلی حکومت بناتے ہیں تو مودی کو ایک ایسی کابینہ کی سربراہی کرنا ہوگی جس میں دیگر پارٹیاں اتحاد میں موجود ہوں گی اور جسے پارلیمانی مشاورت کرنی پڑے گی۔ یہ ایک ایسے شخص کے لیے کسی صدمے کی حیثیت رکھے گا جس نے بڑے فیصلے لینے کے لیے ہمیشہ اپنی من مانی کی ہو اور بغیر کسی

مداخلت کے چیف ایگزیکٹو کے اختیارات کو استعمال کیا ہو۔ بی جے پی کے اندر مودی کے جانشین کی بحث چھڑے گی اور اگر مودی اپنی یہ مدت پوری بھی کر لیتا ہے تو اس کی چوتھی مدت کا امکان کم ہے۔''

دوسری طرف حزب اختلاف کی مرکزی جماعت انڈین نیشنل کانگریس 99 نشستوں کے ساتھ ان انتخابات میں دوسری بڑی جماعت کے طور پر سامنے آئی ہے۔ کانگریس نے 27 دیگر اپوزیشن جماعتوں کے ساتھ بی جے پی کا مقابلہ کرنے کے لیے 'انڈین نیشنل ڈیموکریٹک انکلوسیو الائنس' (انڈیا) نامی ایک اتحاد تشکیل دیا تھا جس نے اس چناؤ میں 232 سیٹیں حاصل کی ہیں۔ کانگریس کی حاصل کردہ نشستوں کا اگر گزشتہ الیکشن سے موازنہ کیا جائے تو 47 کے اضافے کے ساتھ بظاہر یہ ایک قابل ذکر پیش رفت لگتی ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی متبادل قوت کے طور پر نمودار ہو رہی ہے یا عوامی مسائل کے حل کا کوئی ٹھوس پروگرام رکھتی ہے۔ بلکہ کانگریس کا الیکشن منشور بھی سیکولرزم اور جمہوریت وغیرہ کی نعرے بازی کے ساتھ انہی نیولبرل پالیسیوں کا تسلسل تھا جو مودی یا اس کے اتحادی لے کر چل رہے ہیں۔ ایسے میں یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ یہ ووٹ بنیادی طور پر اپوزیشن کے نیولبرل ایجنڈا یا پالیسیوں سے ہم آہنگی سے زیادہ مودی کی عوام دشمن پالیسیوں کے خلاف عوامی غصے کا جزوی اظہار ہے۔ جس نے ہندوتوا کے فسطائی عزائم کو حالیہ انتخابات میں بری طرح گھائل کر دیا ہے۔

الیکشن کے نتائج پر دی اکانومسٹ مزید لکھتا ہے، ''ایک دہائی تک اقتدار پر قابض رہنے کے بعد نریندر مودی کے اس سال کے انتخابات میں بھاری اکثریت سے جیتنے کی پیشین گوئی کی گئی تھی مگر پھر 4 جون کو یہ واضح ہو گیا کہ ان کی پارٹی اپنی پارلیمانی اکثریت کھو چکی ہے اور وہ اتحاد کے ذریعے حکومت کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ انتخابات کے یہ نتائج... مودی کے منصوبوں کو جزوی طور پر پٹڑی سے اتار دیں گے۔ یہ سب سیاست میں مزید بگاڑ کا موجب بنے گا جس نے پہلے ہی مالیاتی منڈیوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ یہ انتخابی نتائج بھارت کے آمریت کی طرف بڑھنے کے خطرے کو کم کرتے ہیں۔''

گزشتہ پوری دہائی مسلسل اقتدار میں رہنے کے باوجود بھی مودی سرکار اپنا کیا کوئی بھی وعدہ پورا نہیں کر سکی ہے۔ اس دوران نفرت اور دھونس کی سیاست اور فریب پر مبنی پراپیگنڈے سے بھارت کے اندر اور باہر لوگوں کو گمراہ رکھنے کی کوشش ہی کی گئی ہے۔ بھارت میں شوچالے (ٹوائلٹس)

بنانے کی بات ہو یا پھر سالانہ دو کروڑ نوکریاں پیدا کرنے کا منصوبہ، یہ تمام تر وعدے محض نعروں اور بھاشنوں کی حد تک ہی محدود رہے۔ حالیہ انتخابات کے نتائج محض بی جے پی کی رجعتی سیاسی و ثقافتی پالیسیوں کا نتیجہ نہیں بلکہ اصل سبب وہ بدترین معاشی جبر ہے جس نے غربت کی اتھاہ گہرائیوں میں دھنسے بھارتی عوام کی زندگیوں کو تاراج کر کے رکھ دیا ہے۔

کسانوں کے خلاف متنازعہ زرعی اصلاحات کے قوانین بنانے جیسے اقدامات ہوں یا پھر پبلک سیکٹر کی نجکاری جیسی پالیسیوں کا نفاذ، مودی سرکار کے اقتدار کے دوران اس قسم کی قومی پالیسیاں تشکیل دی گئیں جو نہ صرف محنت کشوں سے روزگار چھیننے کا سبب بنیں بلکہ لیبر قوانین میں اصلاحات کے نام پر عوام سے ان کے آئینی اور جمہوری حقوق تک غصب کرنے کی کوشش کی گئی۔

ان مظالم کے خلاف نہ صرف کروڑوں محنت کشوں نے مودی سرکار کے خلاف آواز بلند کی بلکہ کسانوں کے احتجاجوں نے پورے سماج کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ بھارت کی دیہی آبادی کی اکثریت کے حالات دن بدن بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ ہندوستان کی ایک ارب چالیس کروڑ آبادی کا ستر فیصد (تقریباً آٹھ سو ملین) دیہی آبادی پر مشتمل ہے جو بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر زراعت سے منسلک رہتا ہے۔ برطانوی راج کے خاتمے کے ستر سال گزرنے کے باوجود یہاں کی دیہی آبادی کی اکثریت کے حالات میں کوئی مثبت تبدیلی رونما نہیں ہو سکی اور چھوٹے کسانوں کے حالات بدتر ہی ہوتے جا رہے ہیں۔ درحقیقت یہ اس خطے کی پسماندہ اور تاخیر زدہ سرمایہ داری کی ہی ایک اور تاریخی ناکامی ہے کہ وہ زراعت کو جدید تکنیکی بنیادوں پر استوار کرنے سے قاصر رہی ہے۔ شہروں میں بسنے والی آبادی کی اکثریت بھی غربت اور تنگی میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ گیارہ ملین افراد ہر سال بھارتی دیہاتوں سے شہروں کا رخ کرتے ہیں جنہیں روزگار کی مسلسل تلاش میں جوانی ہی نصیب نہیں ہوتی۔ شہروں میں تیزی سے جھونپڑ پٹیوں کا رجحان بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ آبادی کی اکثریت شہروں کے مہنگے کرائے کے مکان حاصل نہیں کر سکتی۔ ایسے میں فٹ پاتھوں کو بستر بنایا جاتا ہے جہاں اکثر امیر زادوں کی گاڑیاں انہیں کیڑے مکوڑوں کی طرح کچل دیتی ہیں۔

دوسری طرف انتخابات سے قبل میڈیا پر جس 'معاشی ترقی' کا واویلا کیا جا رہا تھا وہ بیشتر صورتوں میں اعداد کی ہیرا پھیری کے سوا کچھ نہیں۔ یہ ترقی سرکاری اعداد و شمار کے مطابق بھی پچھلی پوری دہائی کی کم ترین سطح پر کھڑی ہے۔ لیکن غیر سرکاری ماہرین معیشت مودی سرکار کے جاری کردہ اعداد و شمار پر مسلسل سوال اٹھاتے رہے ہیں۔ تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ اگر درست طریقے سے پیمائش کی جائے تو ہندوستان کی ترقی کی شرح سرکاری طور پر بتائی جانے والی شرح سے کم ہے۔ ماہرین کے مطابق ہندوستان میں ہونے والی یہ معاشی ترقی خاطر خواہ نیا روزگار پیدا کرنے سے قاصر رہی ہے اور خاص طور پر نوجوانوں میں یہ بڑے پیمانے پر مایوسی پھیلانے کا باعث بن رہی ہے۔ یہ نوجوان ملک کی آبادی کا 80 فیصد بنتے ہیں جن کی بڑی تعداد آج عملاً بیروزگار ہے۔ انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن (ILO) کی تازہ رپورٹ کے مطابق بھارت میں بیروزگاری کی شرح دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ دوسری طرف روزگار دینے کے نام پر جن پراجیکٹوں کو شروع کیا جا رہا ہے اُن کا مقصد روزگار دینے سے زیادہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کو مالی فائدہ پہنچانا ہے۔ مثال کے طور پر 2023ء میں مودی حکومت نے الیکٹرانک چپس بنانے والی ایک کمپنی 'مائیکرون' سے معاہدہ کیا جس کے نتیجے میں گجرات میں 2.75 بلین ڈالر کا ایک پلانٹ لگایا جائے گا۔ اس پلانٹ سے بالواسطہ یا بلا واسطہ تقریباً 20 ہزار نوکریاں پیدا ہوں گی۔ تاہم اس پراجیکٹ کی ستر فیصد رقم حکومت ادا کرے گی۔ یعنی حکومت تقریباً ایک نوکری کی مد میں مائیکرون کو ایک لاکھ ڈالر ادا کرے گی۔

لیکن اقتدار بی جے پی کا ہو یا کانگریس کے پاس ہو، پچھلی سات دہائیوں سے بھارتی عوام کا کوئی ایک بنیادی مسئلہ بھی حل نہیں ہو سکا ہے۔ اس وقت بھارت میں حالت یہ ہے کہ طبقاتی نابرابری اور امیر و غریب کے درمیان خلیج برطانوی نوآبادیاتی قبضے کے دور سے بھی کہیں زیادہ وسیع ہو چکی ہے۔

اسی طرح بھارتی حکومت غربت میں کمی کے نام پر مسلسل سفید جھوٹ بولتی رہی ہے۔ سرکاری ڈیٹا بیس کے مطابق بھارت میں سے غربت کا تقریباً خاتمہ کیا جا چکا ہے۔ حکومت کے مطابق بارہ سال پہلے تک بھارت میں ہر 100 میں سے 12 افراد 1.90 ڈالر (پرچیزنگ پاور پیریٹی) یا اس سے کم روزانہ پر گزارا کیا کرتے تھے جبکہ یہ تعداد سکڑ کر اب 100 میں سے دو افراد ہو چکی ہے۔ مگر ورلڈ بینک کی جاری کردہ کثیر جہتی پاورٹی انڈیکس رپورٹ کو مدنظر رکھا جائے پتا چلتا ہے کہ دنیا کے ایک تہائی سے زیادہ غریب لوگ جنوب

بی جے پی کا گڑھ سمجھے جانے والی اور بھارت کے سب سے زیادہ تقریباً 80 پارلیمانی حلقے رکھنے والی ریاست اُتر پردیش میں بھی اُنہیں ایک طرح سے شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ یاد رہے کہ یہ وہی ریاست ہے جہاں بی جے پی کو گزشتہ انتخابات میں 64 نشستیں حاصل ہوئی تھیں مگر اب یہ سیٹیں سکڑ کر 33 ہو چکی ہیں۔

ایشیا میں رہتے ہیں۔ اس تعداد میں سے 70 فیصد افراد کا تعلق صرف ہندوستان سے ہے۔ اسی طرح گزشتہ سال اکتوبر میں جاری کیے گئے گلوبل ہنگر انڈیکس میں کُل 125 ممالک میں سے بھارت 111ویں نمبر پر تھا۔ یعنی دنیا کے بھوکے ترین ممالک میں شامل تھا۔ اس انڈیکس کے مطابق 2015ء کے بعد سے بھارت میں بھوک کے خلاف پیش رفت تقریباً رُک ہی گئی ہے۔ عالمی اداروں کی یہ رپورٹیں بھی زمینی صورتحال کی بالکل درست یا حقیقی نشاندہی نہیں کرتی ہیں۔ لیکن انہیں ایک عمومی اشارے کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اپنی انتخابی مہم کے دوران بی جے پی نے بھرپور کوشش کی کہ کسی طرح مودی کو ایک ناقابل شکست سیاستدان قرار دیا جائے۔ لیکن صرف یہ ہندو بنیاد پرست ہی نہیں بلکہ میڈیا، سماجیات اور اخلاقیات کے ان داتا بھی مودی کو بھگوان بنانے کی مہم میں پاگل ہوئے جا رہے تھے۔ جو دراصل بھارت کی حاوی دانش کی ثقافتی اور فکری زوال پذیری کی غمازی کرتا ہے۔ ہر طرف بظاہر مودی کا بول بالا ہونے کے باوجود بھی ان انتخابات میں اس کی پسپائی واضح کرتی ہے کہ سماجی سطح کے نیچے خاصی بے چینی اور غم و غصہ موجود ہے۔ علاوہ ازیں بھارتی سماج اور ریاست کو ہندوتوا پر مبنی آمریت کے نرغے میں لانا بھی اس کے لئے اتنا آسان نہیں ہوگا۔

مودی سرکار کے خلاف پچھلے کئی سالوں سے ستمبر میں ہونے والی عام ہڑتالوں اور پھر کسانوں کی پے در پے تحریکوں نے بغیر کسی شک و شبہ کے ثابت کیا ہے کہ طبقاتی جدوجہد ایک پسپائی کے باوجود نہ صرف زندہ ہے بلکہ بھڑک بھی سکتی ہے۔ اب لڑکھڑاتے اقتدار میں مودی زیادہ زہریلے اور شدید معاشی، سیاسی و سماجی حملے کرے گا جس کے خلاف محنت کش طبقے کا ردعمل غیر معمولی بھی ہو سکتا ہے۔

لیکن اقتدار بی جے پی کا ہو یا کانگریس کے پاس ہو، پچھلی سات دہائیوں سے بھارتی عوام کا کوئی ایک بنیادی مسئلہ بھی حل نہیں ہو سکا ہے۔ اس وقت بھارت میں حالت یہ ہے کہ طبقاتی نابرابری اور امیر و غریب کے درمیان خلیج برطانوی نوآبادیاتی قبضے کے دور سے بھی کہیں زیادہ وسیع ہو چکی ہے۔ مودی دور کے اونچے گروتھ ریٹوں کے کم و بیش تمام ثمرات سرمایہ داروں (اور کسی قدر مڈل کلاس کی بالائی پرتوں) نے ہی سمیٹے ہیں۔ لیکن پہلے بھی ہر دورِ اقتدار میں عوام کی معاشی اور سماجی حالت پتلی ہی ہوتی گئی ہے۔ آج پاکستان اور دنیا کے بیشتر ممالک کی طرح تمام مروجہ سیاسی جماعتوں کا معاشی پروگرام عملاً ایک ہی ہے۔ ذات پات، قومیت، مذہب اور پاکستان دشمنی کی رجعتی سیاست سے ہی لوگوں کے حقیقی مسائل کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بائیں بازو کی اصلاح پسندی میں غرق کمیونسٹ پارٹیاں بھی استرداد کا شکار ہی ہوئی ہیں۔ ان پارٹیوں کی حالت یہ ہے کہ وہ سوشلزم اور کمیونزم کا نام تک لینا گوارا نہیں کرتیں۔ ان کی قیادت نظام سے مصالحت کر چکی ہے اور اسی نظام کے اندر ان کی ساری سیاست قید ہے۔ مختلف ریاستوں میں وہ بورژوا سیاسی جماعتوں کیساتھ ہی مخلوط حکومت بنانے کے گٹھ جوڑ میں مصروف ہیں۔ مودی سرکار کے اقتدار کے دوران ہوئی انسانی تاریخ کی سب سے بڑی عام ہڑتالوں کے باوجود بھی کوئی خاطر خواہ مزاحمتی یا انقلابی تحریک نہ چلا سکنا ان جماعتوں کی نظریاتی زوال پذیری کی نشاندہی کرتا ہے۔ ان کی سیاست دراصل وہی جمہوریت اور سیکولرزم کی نام نہاد ترقی پسندی ہے جس کے پیچھے کوئی انقلابیت نہیں ہے۔ طبقاتی جدوجہد کے انقلابی پروگرام کے بغیر یہ تاریخ کے کوڑے دان میں غرق ہو کر رہ جائیں گی۔ بلکہ اس سمت میں خاصی پیش رفت ہو بھی چکی ہے۔

گزشتہ انتخابات میں مودی کی جیت کے بعد کامریڈ لال خان نے لکھا تھا کہ ’’انتخابات کے نتائج کسی مخصوص وقت میں سماج کی کیفیت کا پتا دے رہے ہوتے ہیں۔ جیسے کوئی ٹھہری ہوئی تصویر ہوتی ہے۔ آنے والے دنوں میں حالات و واقعات تیزی سے بدل کے مودی کی جیت سے زیادہ حیران کن صورتحال پیدا کر سکتے ہیں۔‘‘ ان انتخابات میں بھارتی عوام نے نہ صرف بی جے پی بلکہ پوری دنیا کو حیران کر کے رکھ دیا ہے۔ انہوں نے ثابت کیا ہے کہ سرکاری دھونس، جبر اور پراپیگنڈے کی بھی حدود ہوتی ہیں اور محنت کشوں کے شعور کو یکسر مات نہیں دی جا سکتی۔

لیکن آنے والے عرصے میں گھائل مودی سرکار اور بی جے پی کی طرف سے حملے مزید شدت اختیار کریں گے۔ جس کے ردِعمل میں خود رو تحریکیں ابھر سکتی ہیں اور مخصوص حالات میں انقلابی صورت حال تک پیدا کر سکتی ہیں۔ عالمی سرمایہ داری کا بحران جس نہج کو پہنچ رہا ہے وہاں ایک کے بعد دوسرے ملک میں ایسے حالات پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ اس پورے خطے کو سرمایہ داری کی نہ ختم ہونے والی ذلت اور اذیت سے نکالنے کا کوئی امکان تب تک موجود نہیں جب تک آئی ٹی کے جدید ترین شعبوں سے لے کر فیکٹریوں، ملوں اور کھیتوں کھلیانوں تک محنت کشوں کی مخفی انقلابی طاقت کو منظم اور متحرک کر کے اس نظام کے خلاف صف آرا نہ کیا جائے۔ وگرنہ نیولبرل سرمایہ داری کی بنیاد پرست اور لبرل حکومتیں معاشرے کا بلادکار کرتی چلی جائیں گی۔

عالمی منظر نامہ:

معاشی بحران، سامراجی ٹکراؤ اور طبقاتی بغاوتیں!

ترقی یافتہ ممالک کی معیشتیں ابھی بھی نسبتاً جمود کا شکار ہیں۔ یورپی یونین کی تقریباً تمام اہم معیشتیں 2023ء میں سکڑاؤ یا جمود کا شکار رہی ہیں۔ جاپان اور کینیڈا کی معیشتیں بھی جمود سے دوچار ہوئی ہیں۔ یہی صورت حال آسٹریلیا کی بھی ہے۔ جی 7 میں بدترین صورتحال برطانیہ کی رہی ہے۔

تحریر: آصف رشید

سرمایہ دارانہ نظام کا بحران اپنی شدت اور وسعت میں مسلسل اضافے کے ساتھ زیادہ گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ یہ ایک کثیر الجہتی بحران ہے جو معاشی (افراط زر، گراوٹ، قرض)، ماحولیاتی (موسمیاتی تبدیلیاں، وبائیں) اور سامراجی جیوپولیٹیکل مفادات کے ٹکراؤ (جنگیں، عالمی مسابقت اور تقسیم) کی شکل میں اپنا اظہار کر رہا ہے۔ سب سے بڑھ کر اس نظام کو ایک نظریاتی بحران کا سامنا ہے۔ ایک مسلسل عدم استحکام ہے۔ معیشت سنبھل نہیں پا رہی۔ سیاست دائیں اور بائیں بازو کے درمیان جھول رہی ہے۔ ماحولیاتی تباہی اس کرۂ ارض پر زندگی کو معدومی کے خطرے سے دوچار کیے ہوئے ہے۔ 2008ء کے مالیاتی انہدام نے امریکہ کے معاشی، سیاسی اور سفارتی غلبے کو خاصا کمزور کر دیا ہے۔ بالخصوص عراق اور افغانستان میں شکستوں کے بعد امریکی بالادستی کمزور ہونے سے افریقہ، مشرق وسطیٰ، جنوب ایشیا اور لاطینی امریکہ میں چین اور روس سمیت نئی علاقائی سامراجی طاقتوں کی مداخلت نے نئے تضادات کو جنم دیا ہے۔ آیئے اس منظرنامے کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔

مشکلات سے دوچار عالمی معیشت

پچھلے ہفتے ورلڈ بینک نے عالمی معیشت کے حوالے سے اپنا تناظر پیش کیا ہے۔ جس میں معاشی ماہرین کا کہنا ہے کہ عالمی معیشت پچھلے تین سال کی نسبت 2024ء میں مستحکم ہونے جا رہی ہے۔ معیشت 2023ء میں ریسیشن سے بچ گئی ہے اور اب یہ ایک ’سافٹ لینڈنگ‘ کی طرف جا رہی ہے۔ عالمی حقیقی جی ڈی پی کی شرح نمو 2.6 فیصد رہنے کا امکان ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ درست ہے کہ عالمی جی ڈی پی مزید سکڑنے سے بچ گیا ہے لیکن بالخصوص مغرب میں بیشتر بڑی معیشتیں ابھی بھی جمود کا شکار ہیں اور عالمی معاشی شرح نمو وبا سے پہلے کی اوسط 3.1 فیصد کی سطح سے ابھی بھی بہت کم ہے۔ یہ ساری شرح نمو بھی چین، بھارت، روس اور ملائشیا وغیرہ کی معاشی نمو کی بنیاد پر حاصل کی گئی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کی معیشتیں ابھی بھی نسبتاً جمود کا شکار ہیں۔ ترقی پذیر ممالک کی معیشتیں 2019ء کی سطح سے مزید نیچے جا چکی ہیں۔ جبکہ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کی آمدن کا فرق بڑھنے کی طرف گیا ہے۔

جب ہم بڑی معیشتوں کا گہرائی میں جائزہ لیں تو نام نہاد ’سافٹ لینڈنگ‘ ایک مذاق لگتی ہے۔ جی 7 ممالک میں سب سے بہتر کارکردگی امریکی معیشت کی ہے۔ کورونا بحران اور 2022ء کے ریسیشن کے بعد گزشتہ سال معیشت کساد بازاری سے بچ گئی ہے (یورپ کو تیل اور گیس کی برآمدات، انفراسٹرکچر منصوبے، گھریلو صارفین کی جمع شدہ بچتوں کی کھپت وغیرہ۔ یہ وہ عوامل تھے جس کے باعث امریکہ کی معیشت نے نمو حاصل کی)۔ لیکن 2024ء کی پہلی سہ ماہی میں پھر معیشت سست روی کا شکار رہی ہے۔

یورپی یونین کی تقریباً تمام اہم معیشتیں 2023ء میں سکڑاؤ یا جمود کا شکار رہی ہیں۔ جاپان اور کینیڈا کی معیشتیں

عالمی منظر نامہ:

بھی جمود سے دوچار ہوئی ہیں۔ یہی صورت حال آسٹریلیا کی بھی ہے۔ جی 7 میں بدترین صورتحال برطانیہ کی رہی ہے۔ دنیا میں سب سے بہتر صورتحال نام نہاد ابھرتی ہوئی معیشتوں کی رہی جن میں بھارت 6 فیصد (جو اعداد و شمار قابل بھروسہ نہیں)، چین 5 فیصد اور روس کی شرح نمو 3 فیصد رہی۔ روس کے معاملے میں معاشی نمو کے پیچھے زیادہ تر جنگی معیشت کارفرما ہے۔ برازیل ایک فیصد سے نیچے اور جنوبی افریقہ معاشی گراوٹ کا شکار ہے۔ باقی ماندہ ممالک کی صورتحال مخدوش ہی رہی ہے۔ اس سب کے باوجود کوئی بھی معیشت 2008ء اور 2019ء کی سطح پر بحال نہیں ہو سکی۔ بلکہ ایک مسلسل زوال ہے جس میں عارضی پڑاؤ کے کچھ مختصر دورانیے آتے ہیں لیکن عمومی رجحان تنزلی کی طرف ہی ہے۔

ترقی یافتہ ممالک میں پیداواری عمل مسلسل زوال کی کیفیت میں ہے۔ افراط زر میں بھی کوئی خاطر خواہ کمی دیکھنے میں نہیں آئی۔ کورونا وبا کے بعد بڑی معیشتوں میں قیمتوں میں اوسطاً 20 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ امریکہ اور یورپ میں افراط زر کو 2 فیصد تک نیچے لانے کے اہداف پورے نہیں ہو پائے اور یہ ہدف اب 2026ء میں پورا ہونے کا امکان ظاہر کیا جا رہا ہے۔ یورپی سنٹرل بینک نے شرح سود میں 0.25 فیصد کمی کی ہے جبکہ امریکہ میں شرح سود کو 5.5 فیصد کی سطح پر برقرار رکھا گیا ہے۔ جس سے مہنگے قرضوں کے باعث نئی سرمایہ کاری مشکل ہو گی اور بہت سی کمپنیاں اور ممالک سود کی ادائیگی اور نئے قرضوں کے حصول میں مشکلات کا شکار رہیں گے۔

امریکہ اور یورپ میں شرح نمو کے سست ہونے کی دو

وجوہات ہیں۔ ایک تو کارپوریٹ منافعوں میں کمی اور دوسرا بلند شرح سود جس کے باعث گھریلو صارفین اور غیر منافع بخش کمپنیوں کو قرض لینے میں دشواری ہو رہی ہے جو آخری تجزیے میں دیوالیوں کے ایک سلسلے کو جنم دے سکتا ہے۔

امریکہ میں نام نہاد شاندار سات سوشل میڈیا اور ٹیکنالوجی کمپنیوں کے بہت چرچے ہیں۔ اس وقت دس بڑی کمپنیوں کی مارکیٹ ویلیو کل عالمی سٹاک مارکیٹ کا 13 فیصد ہے جن کا مجموعی حجم 12 ہزار ارب ڈالر ہے۔ یہ 2000ء کے ڈاٹ کام ببل جو کہ 9.9 فیصد تھا سے بہت اوپر ہے۔ ان شاندار سات (ٹی ایلفا بیٹ، ایمازون، ایپل، میٹا، مائیکروسافٹ، اینویڈیا اور ٹیسلا) کی پچھلے سال کی کمائی میں 58 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ جبکہ ایس اینڈ پی 500 انڈیکس کی باقی ماندہ 493 کمپنیوں کی کمائی میں دو فیصد کمی واقع ہوئی ہے۔ الیکٹرک کاروں اور مصنوعی ذہانت کو لے کر ایک خبط یا بخار موجود ہے جس کا انحصار امریکہ میں شرح سود میں بڑی کمی پر تھا جو کہ نہیں ہو سکی۔ امریکہ میں پیداواری سیکٹر اور غیر پیداواری سیکٹر کا انحصار سستے قرضوں پر ہے جو کہ فیڈل ریزرو (مرکزی بینک) کی نئی پالیسی کے تحت شرح سود میں کوئی کمی نہ ہونے کی صورت میں قرض خواہوں کے لیے نئی مشکلات لے کر آ رہا ہے۔

زیادہ سنگین مسئلہ عالمی جنوب کے ممالک کا ہے۔ عالمی قرضوں میں پچھلے سال 15 ہزار ارب ڈالر کے اضافے کے ساتھ اب مجموعی عالمی قرضہ 313 ہزار ارب ڈالر تک پہنچ چکا ہے (ایک اندازہ۔ باقی اندازے اس سے زیادہ کے ہو سکتے ہیں)۔ سو کے قریب ممالک قرضوں کی ادائیگی کی وجہ سے کٹوتیوں کی پالیساں نافذ کرنے پر مجبور ہوں گے۔ جس سے پولرائزیشن اور طبقاتی کشمکش میں شدت آئے گی۔ یہ صورتحال ہم دیگر کئی دوسرے ممالک سمیت لبنان، سری لنکا،

سوڈان اور حالیہ دنوں میں کینیا میں دیکھتے آرہے ہیں۔

جمود کا شکار منڈیاں بیرونی تجارت کے ذریعے بھی اب اس مسئلے کو حل نہیں کرسکتیں۔ کورونا وبا میں تجارتی گراوٹ کے بعد 2023ء میں بھی عالمی تجارت گراوٹ کا شکار رہی ہے۔ امریکہ اور یورپ نے چین کے خلاف نئی تجارتی پابندیوں کی ایک یلغار شروع کردی ہے۔ جس سے چین کو تو کوئی خاص فرق نہیں پڑ رہا لیکن ان پابندیوں کی قیمت امریکی اور یورپی صارفین کو مہنگائی کی صورت میں ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ 2008ء کے بعد سے عالمی تجارت اور سرمایہ کاری کے تناظر میں گلوبلائزیشن ایک عمومی زوال کا شکار چلی آ رہی ہے۔

سرمائے کی نسبت ہی شرح منافع بناتی ہے اس لیے یہ شرح گر جاتی ہے۔'' (سرمایہ، جلد 3، باب 13)

شرح منافع میں گراوٹ کا رجحان کئی طرح کے مزید مسائل یا تضادات کو جنم دینے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ ذرائع پیداوار کی ترقی اور بڑھوتری اور نئے روزگار کی تشکیل کے لیے درکار نئی سرمایہ کاری بھی منافع سے حاصل ہوتی ہے۔ قرضوں کی واپسی کا عمل بھی شرح منافع کی گراوٹ کے باعث مشکل ہوتا چلا جاتا ہے اور کمپنیوں اور ملکوں کے قرضوں کا حجم بڑھنے سے دیوالیے کا خطرہ بھی بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح دولت کے ارتکاز اور سرمایہ دار طبقے کے ارتقا کے لیے بھی منافعے درکار ہوتے ہیں۔

رہتا ہے۔ اسی سے مختلف شکلوں میں پھر زائد پیداوار کا بحران بھی جنم لیتا ہے۔ یہ عمل گزشتہ کئی دہائیوں سے جاری ہے۔ پیداواری عمل میں شرح منافع کی گراوٹ غیر پیداواری شعبے (سٹاک مارکیٹ، رئیل اسٹیٹ، گورنمنٹ بانڈز وغیرہ) میں سٹے بازی، مالیاتی ہیر پھیر اور کرپٹو کرنسی جیسے بلبلے بناتی ہے۔ جس میں قیمتیں اس قدر بڑھ جاتی ہیں کہ وہ اصل قدر سے کئی گنا زیادہ ہو جاتی ہیں۔ جو پھر کریش اور مالیاتی بحرانوں کی صورت اپنا اظہار کرتا ہے۔ اس وقت بھی یورپ اور امریکہ میں یہ رجحان پھر 2008ء کے کریش کی شکل میں دوبارہ پھٹ کر سرمایہ داری کو ایک اور بڑے مالیاتی بحران کی طرف لے کر جا سکتا ہے جو ناگزیر طور پر معیشت کی گہری زوال پذیری پر منتج ہوگا۔

شرح منافع کا بحران

کارل مارکس نے 'سرمایہ' میں لکھا تھا کہ ''عمومی شرح منافع میں گراوٹ سرمایہ دارانہ طرز پیداوار کا ایک مخصوص اظہار ہوتا ہے۔ یہ محنت کی سماجی پیداواریت (Productivity) کے ارتقا کی غمازی کرتا ہے۔ اس کے یہ معانی نہیں ہیں کہ عارضی طور پر شرح منافع کی گراوٹ کی دوسری وجوہات نہیں ہوسکتیں۔ لیکن اگر ہم سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار کی فطرت کے حوالے سے جائزہ لیں تو ثابت ہوتا ہے کہ اس کے ارتقا میں قدر زائد کی عمومی شرح' منافع کی گراوٹ میں اپنا اظہار کرتی ہے۔ چونکہ زندہ با روزگار محنت کی بڑی تعداد اپنی پیدا کردہ مادی محنت (مشینری و ٹیکنالوجی) کے مقابلے میں مسلسل تنزلی کا شکار ہوتی ہے... زندہ محنت کا... حصہ مجموعی سرمائے کی قدر کے مقابلے میں لازمی طور پر مسلسل گرتا چلا جاتا ہے۔ چونکہ قدر زائد سے مجموعی لگائے گئے

شرح منافع کو برقرار رکھنے کے لیے سرمایہ داروں کو قدر زائد میں مسلسل اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ جس کے لیے اجرتوں میں کمی کی جاتی ہے، اوقات کار بڑھائے جاتے ہیں، پیداواری عمل کو تیز کیا جاتا ہے اور مزید جدید مشینری اور ٹیکنالوجی متعارف کروائی جاتی ہے (یہ آخری عامل لمبے عرصے میں پھر شرح منافع کو گرانے کی طرف جاتا ہے)۔ اس کے علاوہ پیداوار بھی دوسرے علاقوں اور خطوں میں منتقل کی جاتی ہے جہاں اجرتیں کم ہوں۔ معیشت کے زیادہ منافع بخش شعبوں کی نجکاری کر کے انہیں سرمایہ داروں کے حوالے کیا جاتا ہے۔ ان طریقوں سے وقتی طور پر شرح منافع کو بحال کیا جا سکتا ہے۔ جیسے کہ 1980ء کے بعد نیولبرل معاشی پالیسوں کے ذریعے کسی حد تک شرح منافع کو بحال کیا گیا تھا۔ لیکن لمبے عرصے میں سرمایہ داری کے خمیر میں موجود تضادات کے باعث شرح منافع میں گراوٹ کا رجحان برقرار

> گزشتہ دہائیوں میں شرح منافع کے بحران کا ایک اظہار منڈیوں کے تیز پھیلاؤ اور گلوبلائزیشن کی صورت میں نظر آیا تھا۔ جس میں منافعوں میں اضافے کے لیے سستی لیبر والے ممالک میں پیداوار کو منتقل کیا گیا۔ لیکن آج امریکہ اور چین کے درمیان تجارتی پابندیوں اور تحفظاتی پالیسیوں کی شکل میں اس کا انت ہوتا نظر آرہا ہے۔ جس سے عالمی سطح پر تناؤ اور تضادات بھڑک رہے ہیں۔ نئی جنگوں کے امکانات بن رہے ہیں۔ وہ تمام تر پالیسیاں جو ماضی میں بحران سے نکلنے کے لیے اپنائی گئی تھیں آج اپنے الٹ میں بدل کر نئے مسائل کو جنم دے رہی ہیں۔

سرمایہ داری اپنے ماضی کے تمام آپشنز استعمال کرچکی ہے۔ اس کی حدود میں شرح منافع کے بحران کا کوئی حل موجود نہیں ہے۔ سرمایہ داری کے بحران کا ہر پہلو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ نظام پیداواری قوتوں کو ترقی دینے اور انسانیت کو آگے بڑھانے کی صلاحیت کھو چکا ہے۔ بلکہ دولت کے دو بنیادی ماخذوں فطرت اور انسانیت کی بے نظیر تباہی کر رہا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام پوری رفتار کے ساتھ اور کسی بریک کے بغیر انسانیت کو بربریت اور خاتمے کی جانب دھکیل رہا ہے۔ موجودہ نظام میں اس بربادی کو روکنا یا واپس لانا ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ اس نظام کی خصلت میں شرح منافع کی بحالی

کی تباہ کن کوششوں کے برخلاف جانے کی صلاحیت نہیں ہے۔

سامراجی تضادات اور تناؤ

موجودہ عالمی بحران کا ایک اہم پہلو سامراجی تناؤ اور تضادات کی بڑھتی ہوئی شدت ہے۔ بڑی سامراجی طاقتوں کے درمیان ٹکراؤ، علاقائی جنگوں اور نیم نوآبادیاتی ممالک کے خلاف سامراجی جارحیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ امریکہ کی کمزوری اور چین کے معاشی اور عسکری اثر ورسوخ میں اضافہ، نئی منڈیوں اور خطوں پر اپنی بالادستی اور لوٹ مار میں حصہ داری پر عالمی تنازعہ ہے۔ عراق اور افغانستان میں امریکہ کی شکست نے امریکی بالادستی کو کمزور کیا۔ جس کی وجہ سے چین اور دوسری چھوٹی یا ابھرتی ہوئی سامراجی طاقتوں کی مداخلت کی گنجائش بڑھ گئی ہے۔ یوکرائن جنگ، افریقی ساحلی ممالک میں فوجی بغاوتیں اور اسرائیل کی جانب سے فلسطینیوں پر ننگی جارحیت اسی عمل کے شدید ترین اظہار ہیں۔

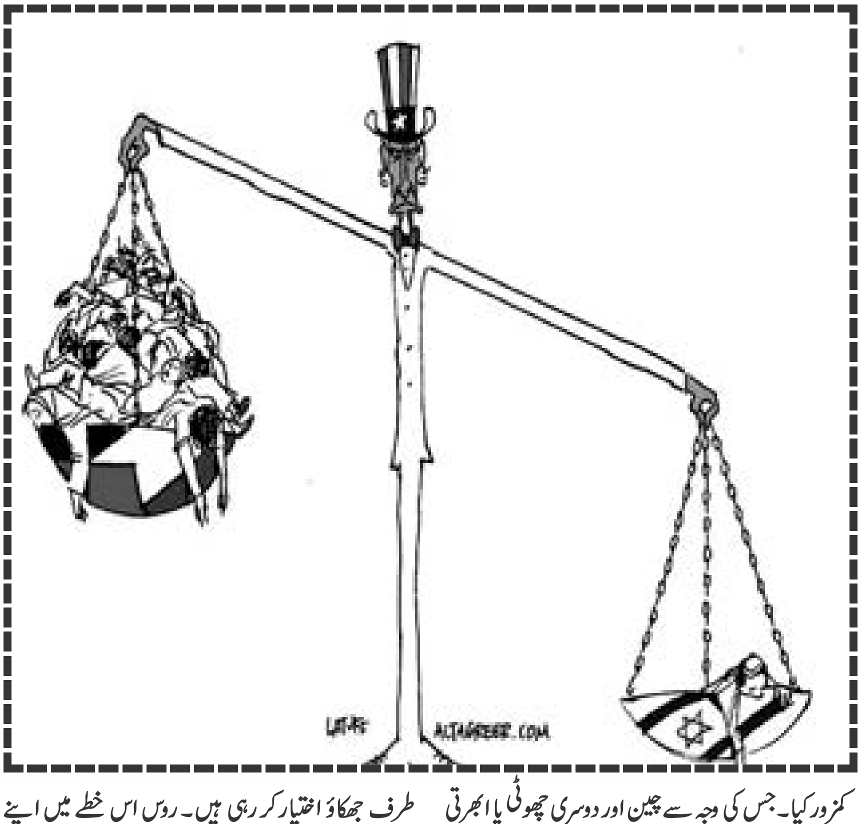

یوکرائن میں روس سوویت یونین کے انہدام کے بعد کھو جانے والے علاقے اور اثر و رسوخ دوبارہ حاصل کرنا چاہتا ہے جبکہ نیٹو ممالک امریکہ کی قیادت میں اپنے سامراجی توسیع پسندانہ عزائم کو بڑھاوا دے رہے ہیں۔ امریکہ کی روس کو کمزور کرنے کی پالیسی زیادہ کامیاب نظر نہیں آتی۔ اسے یورپ کے متبادل چین کی شکل میں اپنا تجارتی اور سامراجی عزائم کا پارٹنر مل چکا ہے جبکہ یوکرائن امریکی و یورپی جنگی امداد پر منحصر ایک نہ ختم ہونے والی جنگ میں برباد ہو رہا ہے۔ اس تنازعے کا فوری حل فی الحال ممکن نظر نہیں آ رہا۔

افریقہ کے ساحلی ممالک میں فرانسیسی اور امریکی سامراج کی کٹھ پتلی حکومتوں کے خلاف بغاوتوں کا ایک سلسلہ جاری ہے جن میں گنی، برکینا فاسو، مالی، نائیجر، گبون، مرکزی افریقی ریپبلک اور سوڈان وغیرہ شامل ہیں۔ یہ مغربی سامراج پر ایک کاری ضرب ہے جو صدیوں سے اس خطے کے معدنی وسائل کی لوٹ مار میں ملوث ہے۔ لیکن یہ نئی فوجی حکومتیں مغربی سامراج کے مقابلے میں اب روس اور چین کی طرف جھکاؤ اختیار کر رہی ہیں۔ روس اس خطے میں اپنے پرائیویٹ فوجی گروہوں مثلاً واگنر گروپ کے ذریعے مداخلت بڑھا رہا ہے۔ یہ گروہ نئی افریقی حکومتوں کے ساتھ نئے کاروباری اتحاد قائم کر رہے ہیں۔ چین بھی اس صورتحال سے فائدہ اٹھا کر معاشی اور سیاسی مفادات کے حصول کے لیے کافی پیش رفت کر رہا ہے۔ افریقہ کے ساحلی خطے میں چین اور روس کا کردار کسی ترقی پسند متبادل کی بجائے اپنے تذویراتی اور کاروباری مفادات کا حامل ہے۔ افریقی محنت کشوں کی نوآبادیاتی و سامراجی جبر کے خلاف ابھرنے والی یہ بغاوتیں انقلابی سوشلسٹ پروگرام سے لیس ہو کر ہی دنیا بھر کے محنت کشوں کے لیے جدوجہد کے نئے راستوں کا تعین کر سکتی ہیں۔

عالمی بالادستی کی کشمکش میں چین اور امریکہ بڑے حریف ہیں۔ معاشی میدان میں چین نے امریکہ کی بالادستی کو کافی کمزور کیا ہے۔ چین اس وقت یورپی یونین، افریقہ، مشرق وسطیٰ اور لاطینی امریکہ کا سب سے بڑا تجارتی شراکت دار ہے۔ جدید ترین ٹیکنالوجی اور مصنوعی ذہانت کے شعبوں میں چین امریکہ کو پچھاڑ رہا ہے۔ برکس ممالک کے ساتھ تجارتی تعاون، بیلٹ اینڈ روڈ اور دیگر انفراسٹرکچر کے عالمی منصوبوں میں چین دیوہیکل سرمایہ کاری کر رہا ہے۔ نئے تجارتی معاہدے ہو رہے ہیں۔ بندرگاہیں بن رہی ہیں اور چین ملک سے باہر نئے فوجی اڈے تعمیر کر رہا ہے۔ چین کی یہ پیش رفت امریکہ کو زچ کر رہی ہے جس سے نئے تنازعات ابھر رہے ہیں۔ اس عمل میں نئی صف بندیاں بھی ہوں گی اور پراکسی جنگیں بھی شدت اختیار کریں گی۔ جب تک سرمایہ داری رہے گی ان سامراجی تضادات اور بحرانوں میں کمی واقع ہونے والی نہیں ہے۔ محنت کش طبقے کی اٹھان اور بڑی فتوحات ہی اس عالمی منظر نامے کو بدل سکتی ہیں۔

ماحولیاتی تباہی اور سرمایہ دارانہ منافقت

2023ء میں پہلی دفعہ زمین کا اوسط درجہ حرارت (وقتی طور پر) دو ڈگری سینٹی گریڈ اضافے کی حد کو پار کر گیا ہے۔ دنیا کے 90 فیصد سمندر گرمی کی شدید لہر کی لپیٹ میں ہیں۔ انٹارکٹیکا میں برف بہت تیزی سے پگھل رہی ہے اور اس سال برف کی تہہ میں تاریخی کمی ریکارڈ کی گئی ہے۔ پچھلا سال تاریخ کا گرم ترین سال گزرا ہے اور گزشتہ مئی معلوم تاریخ کا گرم ترین مہینہ تھا۔ نیشنل سینٹر فار انوائیرمینٹل انفارمیشن (امریکہ) کے مطابق 2024ء تاریخ کا گرم ترین سال ہوگا۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ (جو کہ گلوبل وارمنگ کی سب سے بڑی وجہ ہے) کے اخراج کے موجودہ رجحان کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زمین کی سطح کا اوسط درجہ حرارت 2015ء کی پیرس ماحولیاتی کانفرنس میں رکھے گئے ہدف 1.5 ڈگری سینٹی گریڈ اضافے کو ایک دہائی میں کراس کر جائے گا۔ اقوام متحدہ کے ماحولیاتی سیکرٹری سائمن سٹیل کے مطابق کاربن ڈائی آکسائیڈ کے اس اخراج کو فوری طور پر نہ روکا گیا تو درجہ حرارت 2.7 ڈگری اضافے کی حد عبور کر جائے گا۔

عالمی منظر نامہ:

اس کا حل کیا ہے؟

گزشتہ ماحولیاتی کانفرنس (COP28) میں بھی کاربن ڈائی آکسائیڈ کے اخراج کو کنٹرول کرنے یا فضا میں سے اس کے واپس اخراج کے طریقوں پر باتیں ہوئی ہیں۔ فاسل فیول کے استعمال کو نام نہاد گرین انرجی (ہوا، سولر، پن بجلی) سے بدلنے کے لیے ہر سال عالمی ماحولیاتی کانفرنسیں ہو رہی ہیں۔ عالمی پیمانے پر گرین انرجی میں سرمایہ کاری ناکافی ہے کیونکہ فوسل فیول کی پیداوار کو گرین انرجی اتنی تیزی سے ریپلیس نہیں کر پا رہی۔ قابل تجدید انرجی کی عالمی ایجنسی کے اندازے کے مطابق 2030ء تک ہر سال ایک ہزار گیگا واٹ قابل تجدید بجلی عالمی سطح پر بنانے کی ضرورت ہے۔ لیکن عالمی سطح پر یہ منصوبے اس کا ایک تہائی بھی پیدا نہیں کر رہے ہیں اور اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے ہر سال 9 ہزار ارب ڈالر کی سرمایہ کاری درکار ہے جو کہ ابھی محض 1.3 ہزار ارب ڈالر ہے۔ امیر ممالک بھی اس کے لیے درکار فنڈز مہیا نہیں کر رہے۔ امیر حکومتوں نے 2022ء میں صرف 83 ارب ڈالر ہی دیئے جبکہ پرائیویٹ ماحولیاتی فنانس نے صرف 21.9 ارب ڈالر دیئے۔

حکومتیں زیادہ زور اس بات پر دے رہی ہیں کہ پرائیویٹ سرمایہ کار قابل تجدید انرجی میں سرمایہ کاری کریں۔ لیکن پرائیویٹ سرمایہ کاری وہاں پر ہو گی جہاں منافع ہو گا۔ منافع یہاں بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ ترقی یافتہ اٹھارہ ممالک میں 2000ء سے 2015ء تک کاربن ڈائی آکسائیڈ کے اخراج میں اوسط 36 فیصد کمی ہوئی ہے جس کی بنیادی وجہ پھر معاشی سست روی ہے۔

منصوبہ بندی سے عاری منڈیوں میں بے ہنگم پیداوار کی وجہ سے سولر پینل بنانے والی کمپنیوں کے منافعے سکڑ رہے ہیں۔ یہ بھی سرمایہ داری کا تضاد ہے۔ ایک سوشلسٹ منصوبہ بند عالمی معیشت میں ہی منافع خوری اور معاشی انارکی کے عناصر کو ختم کر کے ماحول دوست انویسٹمنٹ کے ذریعے فاسل فیول انڈسٹری کو بند کیا جا سکتا ہے۔ اب اس کرۂ ارض پر زندگی کی بقا انسانیت کے سوشلسٹ مستقبل کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ جس کی تیاری اور جدوجہد آج کے عہد کی اولین ذمہ داری ہے۔

سیاسی پولرائزیشن اور محنت کش طبقہ

سرمایہ داری کے بحران نے پوری دنیا میں سماجی اور سیاسی پولرائزیشن کے عمل کو تیز تر کر دیا ہے جس سے سماج تقسیم اور تصادم کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ بیشتر ممالک میں اس کا سیاسی اظہار انتہائی دائیں بازو کی نیم فسطائی قوتوں کے ابھار کی صورت میں ہو رہا ہے۔ لبرل دایاں بازو اور اصلاح پسند بایاں بازو ماضی قریب میں انتہائی جارحانہ کٹوتیوں کی پالیسیوں پر کاربند رہنے کی وجہ سے بری طرح مسترد ہو رہے ہیں۔ تمام مروجہ بورژوا پارٹیاں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہی ہیں۔ نئے رجحانات اقتدار میں آ رہے ہیں۔ تیز رفتار تبدیلیاں جاری ہیں۔ حکومتیں گر رہی ہیں۔ ریاستیں داخلی تقسیم و بحران کا شکار ہیں۔

انتہائی دایاں بازو فی الوقت خود کو ایک جبر کے ساتھ سماج اور ریاست پر مسلط کرنے سے عاری نظر آتا ہے۔ لیکن محنت کشوں کے لیے ایک چتاونی یا وارننگ ضرور ہے۔ بحران اتنا گہرا ہے کہ مستحکم اقتدار قصہ پارینہ ہو چکا ہے۔ فی الوقت یہ پاپولسٹ یا انتہائی دایاں بازو ماضی کے برعکس محنت کش طبقے کے خلاف کھلم کھلا لڑائی کی بجائے بورژوا جمہوری طریقہ کار کے ذریعے کام کرتا نظر آ رہا ہے۔ اصلاح پسند قیادتیں اس دائیں بازو کے ابھار کو بڑھا چڑھا کر اس لئے بھی پیش کرتی ہیں کہ لبرل بورژوازی کے ساتھ اپنی مصالحت کی روش کو جواز دے سکیں اور محنت کشوں کے سامنے خود کو ایک کمتر برائی کے طور پر قابل قبول بنا سکیں۔ یہ طبقاتی مفاہمت اور غداری ہے۔ انتہائی دائیں بازو کی پیش رفت محنت کش طبقے کے لیے ایک سنجیدہ مسئلہ ہے لیکن دائیں بازو کی یہ پیش قدمی سماج کو انقلابی بنیادوں پر تقسیم بھی کرتی ہے۔ یہ عوام کی زیادہ باشعور پرتوں میں موجودہ نظام کے استرداد، نئے سیاسی امکانات کی تشکیل اور تحریک کی تنظیم اور تحریک میں اضافے کا باعث بھی بن سکتی ہے۔

2023ء میں محنت کش طبقے کی زیادہ سنجیدہ تحریکیں بھی سامنے آئی ہیں۔ امریکہ میں آٹو ورکرز کی کامیاب ہڑتال کے ساتھ پچھلے 50 سالوں میں ہڑتالوں کا سب سے بڑا سلسلہ دیکھنے میں آیا ہے۔ برطانیہ میں شعبہ صحت، اساتذہ اور ریل کے محنت کشوں کی مسلسل تحریک رہی ہے۔ جرمنی میں ریلوے مزدوروں کی طویل ترین ہڑتال ہوئی ہے۔ فرانس میں پنشن اصلاحات کے خلاف تحریک اور کسانوں کے احتجاج جاری ہیں۔ پورے لاطینی امریکہ میں محنت کش طبقے کا ایک نیا ابھار ہے۔ افریقہ میں نوآبادیاتی جبر کے خلاف بغاوتیں ہو رہی ہیں۔ پاکستانی زیر انتظام کشمیر کے عوام نے ایک سال کی جرات مندانہ جدوجہد کے بعد سستی بجلی کا حق چھینا ہے۔ دیگر کئی ایک خطوں میں قومی آزادی کی تحریکیں پرزور انداز میں جاری ہیں۔ حالیہ دنوں میں سب سے شاندار تحریک فلسطین پر اسرائیل کی جارحیت کے خلاف امریکہ کے طلبہ سمیت پوری دنیا میں احتجاجی مظاہروں کی شکل میں سامنے آئی ہے جس نے صیہونیت پر کاری ضرب لگا کر صیہونی ریاست کو عالمی سطح پر مزید تنہا اور مسترد کر دیا ہے۔ یہ ایک وسیع تر سامراج مخالف تحریک کی شکل اختیار کر رہی ہے۔

اس نظام کے بحران اور بربادی کے ساتھ طبقاتی جدوجہد عالمی پیمانے پر مزید تیز ہو گی۔ جس میں محنت کشوں کی نئی ہڑتالیں، احتجاج اور بار بار ابھرنے والی بغاوتیں شامل ہوں گی۔ یہ سلسلہ وقتی پسپائیوں، کٹھنائیوں، شکستوں، فتوحات اور پیش رفتوں کے ساتھ دہائیوں تک جاری رہ سکتا ہے۔ جس میں انقلابی متبادل کی تیاری کے سازگار حالات میسر آئیں گے۔ اس سارے عمل میں عہد حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ انقلابی سوشلسٹ پروگرام اور حالات و واقعات سے مطابقت رکھنے والے طریقہ کار اور لائحہ عمل کے ساتھ دور رس اور صبر آزما مداخلت ہی سرمایہ داری کی ظلمتوں سے نسل انسان کی نجات کی ضامن ہو گی۔

بولیویا میں فوجی کُو کی کوشش

عوامی مزاحمت نے ناکام بنا دی

رپورٹ: انٹرنیشنل سوشلسٹ لیگ

24 جون کو بولیویا کی مسلح افواج کے جنرل کمانڈر ہوان ہوزے زونیگا نے ایک پبلک انٹرویو میں سابقہ صدر ایوو مورالس کو گرفتار کرنے کی دھمکی دی۔ یاد رہے کہ ایوو مورالس 2025ء کے انتخابات میں ممکنہ صدارتی امیدوار ہیں اور اپنی برسر اقتدار سوشلسٹ پارٹی کے دائیں بازو سمیت بولیوین ریاست کے زیادہ رجعتی و سامراج نواز عناصر کی مخالفت اور عتاب کا سامنا کر رہے ہیں۔ 26 جون کو زونیگا پبلک میں دوبارہ نمودار ہوا اور کابینہ میں تبدیلیوں کا مطالبہ کیا۔ اسی دن سہ پہر میں دارالحکومت میں فوجی نقل و حرکت دیکھنے میں آئی۔ زونیگا ایک فوجی بکتر بند گاڑی میں مسلح فوجی اہلکاروں کے دستوں کے ساتھ شہر کے مرکزی چوک میں آیا اور حکومتی ایوانوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ جس کے جواب میں موجودہ صدر 'لوئس آرکے' اور ایوو مورالس نے عوام سے فوجی کُو کے خلاف مزاحمت کی اپیل کی۔ نتیجتاً بڑی ٹریڈ یونینوں اور خواتین و کسانوں کی تحریکوں نے غیر معینہ مدت کیلئے عام ہڑتال کا اعلان کرتے ہوئے عوامی موبلائزیشن شروع کر دی۔ زونیگا کو مسلح افواج اور پولیس کی اکثریت کی حمایت بھی نہیں مل سکی اور دائیں بازو کی اپوزیشن اور چرچ نے بھی اس ایڈونچر سے خود کو دور رکھنے میں ہی عافیت جانی۔ نتیجتاً کُو کی یہ کوشش بہت جلد ٹوٹ کے بکھر گئی اور زونیگا کو گرفتار کر لیا گیا۔ ہم بطور انٹرنیشنل سوشلسٹ لیگ اس رجعتی کُو کی کوشش کی بھرپور مذمت کرتے ہیں اور وسیع تر عوامی موبلائزیشن کی کال کی حمایت کرتے ہیں۔ ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ اس عمل میں ملوث فوجی حکام کو گرفتار کر کے سزائیں دی جائیں۔ ساتھ ہی ہم ایک انقلابی سیاسی متبادل کی تعمیر میں سرگرم عمل ہیں تاکہ تحریک برائے سوشلزم (MAS) کی جعلی ترقی پسندی پر مبنی ناکام تجربے کی بجائے بولیویا کے محنت کش عوام کی امنگوں کے مطابق سامراج اور سرمایہ داری کو اکھاڑ پھینکنے کی حقیقی جدوجہد کو تیز کیا جائے۔

فرانس میں بائیں بازو کے اتحاد کے ہاتھوں فار رائٹ کی شکست

رپورٹ: عمران کامیانہ

دو مراحل پر مبنی فرانس کی قانون ساز اسمبلی کے قبل از وقت انتخابات میں انتہائی دائیں بازو کی جماعت 'نیشنل ریلی' بڑی پیش رفت کے باوجود غیر متوقع طور پر شکست سے دوچار ہو کر تیسرے نمبر پر پہنچ گئی ہے (53 کے اضافے کیساتھ 142 نشستیں)۔ جبکہ فار رائٹ کا راستہ روکنے کیلئے ہنگامی بنیادوں پر تشکیل دیا گیا بائیں بازو کا اتحاد 'نیشنل پاپولر فرنٹ' پارلیمان میں سب سے بڑی قوت کے طور پر ابھرا ہے (180 نشستیں)۔ موجودہ صدر میکرون کا سنٹر رائٹ کا اتحاد دوسرے نمبر پر آیا ہے (86 کی کمی کیساتھ 159 نشستیں)۔ تاہم تینوں میں سے کوئی بھی قوت 577 نشستوں کے ایوان میں اکثریت کی حامل نہیں ہے جس کے نتیجے میں معلق یا 'ہنگ' پارلیمنٹ کا امکان پیدا ہو گیا ہے۔ ڈیڈلاک کی کیفیت برقرار رہتی ہے تو میکرون اگلے ایک سال کیلئے ریاست کا انتظام ٹیکنوکریٹک حکومت کے ہاتھوں میں دے سکتا ہے۔ اگرچہ بائیں بازو کے اتحاد کے اہم رہنما میلونشوں نے بیان دیا ہے کہ ان کا اتحاد حکومت بنانے کو تیار ہے۔ اگرچہ مذکورہ اتحاد خاصی داخلی تقسیموں کا شکار بھی ہے۔ جبکہ دوسری طرف میکرون بھی دائیں اور بائیں بازو کے 'معتدل' عناصر کیساتھ مل کے حکومت کی تشکیل کی کوششیں کر سکتا ہے۔ مستقبل کا منظرنامہ آنے والے دنوں میں ہی واضح ہو گا۔ بہرحال فرانس جیسے یورپ کے کلیدی ملک میں میلونشوں کی ریڈیکل بائیں بازو کی جماعت، گرین پارٹیوں، سوشل ڈیموکریٹوں، کمیونسٹ پارٹی اور مختلف ٹراٹسکائٹ گروہوں پر مبنی اتحاد کے ہاتھوں انتہائی دائیں بازو کی شکست ایک اہم پیش رفت ہے۔

پاکستان اپنی جیوگرافیکل لوکیشن کے حوالے سے ایسا خطہ ہے جہاں موسم شدید رہتا ہے۔ موسم گرما میں مغرب اور جنوب مغرب سے چلنے والی خشک اور گرم ہواؤں کی وجہ سے گرمی کی حدت بہت بڑھ جاتی ہے۔ لیکن رواں برس کی حدت کا موازنہ گزشتہ برسوں کی گرمی سے کیا جائے تو اس سال گرمی کی حدت نے ماضی کے تمام ریکارڈوں کو توڑ دیا ہے۔ عالم یہ ہے کہ درجہ حرارت 52 ڈگری کی حد کو پار کر چکا ہے۔

پگھلتا سیارہ

تحریر: بابر پطرس

(ہندوستان اور مشرق وسطیٰ کے بہت سے علاقوں میں بھی ایسی ہی صورتحال ہے)۔ 52 ڈگری سنٹی گریڈ' 125 فارن ہائٹ کے برابر ہے۔ جبکہ 104 فارن ہائٹ کا درجہ حرارت (بخار) کسی بھی شخص کے لیے جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انسانی جسم اپنی ساخت کے حوالے سے 37 ڈگری سنٹی گریڈ یا 98 فارن ہائٹ کے درجہ حرارت کے لیے بنا ہے اور اسی درجہ حرارت پر اپنی تمام سرگرمیوں کو نارمل انداز میں سرانجام دے سکتا ہے۔ جبکہ اس کے اوپر کا درجہ حرارت انسانی جسم کو منفی انداز میں متاثر کرنا شروع کر دیتا ہے۔ ماحول کا درجہ حرارت اس حد سے جوں جوں بڑھنے لگتا ہے' انسانی جسم کو خود کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے اسی قدر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

دوسرے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ گرمی نقطہ ابال کے نصف سے زیادہ ہے۔ 100 ڈگری سنٹی گریڈ کے درجہ حرارت پر پانی گرم ہو کر نہ صرف کھولنے لگتا ہے بلکہ اپنی ہیت کو بدل کر بھاپ بن جاتا ہے۔ حالت اس قدر سنگین ہوتی جا رہی ہے کہ انسان اس صورت حال میں جینے پر مجبور ہے۔ بند کمروں اور دفاتر کی زندگی دوسری بات ہے۔ لیکن آبادی کی وسیع پرتیں' قریباً 70 فی صد سے زیادہ لوگ کھلے آسمان تلے مشقت کرتے ہیں۔ آگ برساتی دھوپ میں سڑکوں پر روڑی کوٹنا، تارکول بچھانا، ڈیلیوری وغیرہ کے امور سرانجام دینا، تعمیرات اور آگ اگلتی مشینوں پر آٹھ سے بارہ گھنٹے کام کرنا آسان نہیں ہے۔ سورج کی تیز دھوپ اور مشین کی گرمی لہو کو پسینا بنا کر بہا دیتے ہیں۔ یہ غیر انسانی حالات کار ہیں۔ لیکن جسم اور روح کے رشتے کو قائم رکھنے کے لیے محنت کشوں کے پاس ان کٹھن حالات سے سمجھوتا کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ کیونکہ پاکستان میں ایک فیصد سے کم محنت کش ٹریڈ یونین میں منظّم ہیں۔ لہٰذا ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔

ہر سال بڑھتا ہوا درجہ حرارت کسی ایک ملک یا خطے کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ اس سیارے پر موجود انسانی نسل کی بقا کو لاحق بڑا خطرہ بنتا جا رہا ہے۔ موسم اور موسی واقعات شدید ہوتے جا رہے ہیں۔ حالیہ دنوں میں جنوبی امریکہ میں شدید بارشوں کی وجہ سے 90 لوگوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ دبئی اور اس کے ہمسایہ ممالک میں شدید بارشوں سے سیلاب آ گئے۔ موسمی حالات کی وجہ سے صرف برازیل میں ڈیڑھ لاکھ لوگوں کو نقل مکانی کرنا پڑی۔ جنوبی افریقہ کو شدید خشک سالی کا سامنا ہے۔ لوگ اپنی روزمرہ زندگی کے لیے پانی کو ترس گئے ہیں۔ سعودی عرب اور عمان جیسے گرم علاقوں سے زیادہ گرمی جنوب ایشیا کے ملکوں میں پڑ رہی ہے۔ دہلی کا درجہ حرارت دبئی سے بڑھ رہا ہے۔

دوسری جانب نام نہاد بورژوا عالمی قیادت وقت بہ وقت اپنے حلیفوں اور ماہرین کے ساتھ مل کر اس خطرے سے نمٹنے کے لیے کانفرنسوں کا اہتمام کرتی ہے۔ لیکن ان کانفرنسوں کے طویل بحث مباحثوں سے برآمد ہونے والے نتائج صفر ہیں۔ ہر سال گرمی کا اونچا ہوتا پارہ اور غیر معمولی موسمی حالات (شدید بارشیں، سیلاب، خشک سالی، جنگلوں کی آگ، شدید گرمی لہریں، اَن دیکھی برف باریاں وغیرہ) ثابت کرتے ہیں کہ گلوبل وارمنگ اور کلائمیٹ چینج پر قابو پانا سرمایہ دارانہ

ریاستوں کے لیے ناممکن ہے۔ کیونکہ سرمائے کی حاکمیت میں منافع حاصل کرنے اور شرح منافع بڑھانے کی نفسیات کو تبدیل کرنے کی کوشش کرنا حماقت سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

منافعوں کے پاگل پن نے اس ارضی جنت کو دوزخ بنا دیا ہے۔ لہلاتی، سرسبز و شاداب فصلوں والی زرخیز زمین کنکریٹ کے جنگلوں کا روپ دھار گئی ہے۔ ہرے بھرے جنگلات کی تیز رفتار کٹائی اور بے لگام آبادکاری نے باغ عدن کو گرم گولا بنا کر زمین کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ پاکستان ایشیا میں سب سے زیادہ درخت کاٹنے والا ملک ہے جو قریباً پچاس سالوں میں اپنے ایک تہائی جنگلات کو کاٹ چکا ہے اور یہ سلسلہ کہیں رکنے کا نام نہیں لے رہا۔ کیونکہ منافعوں کے حصول کی ہوس کے آگے ہر رشتہ، ناطہ اور تعلق بے وقعت ہے۔

آمد و رفت کے انفرادی یا نجی ذرائع اور ان میں استعمال ہونے والے ایندھن نے آب و ہوا کو زہر آلود کر دیا ہے۔ فضائی آلودگی کا 52 فیصد ٹریفک کی وجہ سے ہے۔ فیکٹریوں کی چمنیوں سے نکلنے والا دھواں اور 'دوسرے جہانوں' کی تلاش وتحقیق پر روانہ ہونے والے سپیس جہازوں میں جلنے والے ایندھن سمیت تمام قسم کے فوسل فیول کے استعمال سے کاربن ڈائی آکسائیڈ اور دوسری مضر گیسیں خارج ہوتی ہیں۔ جو کرۂ ارض کو دہکتا ہوا تندور بناتی جا رہی ہیں۔ خلابازی کے شعبے میں اب نجی کمپنیاں داخل ہو رہی ہیں جو اس ساری ٹیکنالوجی کو تسخیر کائنات کی بجائے منافعوں کے لیے امیروں کی سیر وتفریح اور مستقبل بعید میں خلائی اجسام کے معدنی استحصال کا ذریعہ بنانا چاہتی ہیں۔ لیکن ان سرگرمیوں سے جو ماحولیاتی آلودگی پیدا ہو گی اس کا خمیازہ ایک بار پھر اس دنیا کے غریب اور عام لوگ ہی بھگتیں گے۔

شدید سردی میں اچانک گرمی کا احساس کوئی اچنبھے کی بات نہیں رہی۔ یا گرمی کی حدت میں یخ بستہ ہوائیں چلنا اب کوئی انوکھی داستان نہیں ہے۔ دراصل گلوبل وارمنگ نے اس کرّے کے موسموں کی فطری ترتیب کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ سردی اور گرمی کا درمیانی موسم گئے وقتوں کا قصہ بنتا جا رہا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشت نے اجتماعی ترقی کے بجائے انفرادی بقا اور فائدے کی نفسیات کو پروان چڑھایا ہے۔ اس نفسیات کے تحت یہ سیارہ زندگی کے لیے ناسازگار بنتا جا رہا ہے۔ ہوا میں کاربن کی مقدار اس تواتر سے بڑھ رہی ہے کہ سانس لینا دشوار ہوتا جا رہا ہے اور سموگ جیسے مظاہر جنم لے رہے ہیں۔ نوبت یہاں تک آن پہنچی ہے کہ چین اور بھارت جیسے ملکوں میں تازہ ہوا سیلنڈروں میں فروخت کی جا رہی ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حالت کس قدر تشویشناک ہے۔

یہ بات بھی ذہن نشین ہونی چاہیے کہ گلوبل وارمنگ کا مطلب محض گرمی میں اضافہ نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق آب و ہوا میں ڈرامائی تبدیلی سے ہے۔ گلوبل وارمنگ جہاں بحیثیت مجموعی گرمی کی حدت میں اضافے کا سبب بن رہی ہے وہاں مختلف خطوں میں طوفانی بارشوں سمیت سیلابی صورت حال کی ذمہ دار بھی ہے۔ اس سے خشک سالی اور قحط بھی جنم لے رہے ہیں۔ میٹھے پانیوں کے ذخائر پگھل کر کھارے پانیوں میں شامل ہو رہے ہیں۔ اس سے میٹھے پانی کا بحران شدید ہو جائے گا اور آبادی کی اکثریت کو پینے کے پانی کی قلت کا سامنا ہو گا۔ پاکستان میں سندھ سے بلوچستان اور جنوبی پنجاب تک کے بیشتر علاقے پانی کے حوالے سے پہلے ہی شدید عدم تحفظ کا شکار ہیں۔

گلیشیرز کے پگھلاؤ سے جہاں دنیا کا دو فیصدی پینے کے پانی کا ذخیرہ سمندروں میں مل جائے گا وہاں سطح سمندر بلند ہو کر سینکڑوں ساحلی علاقوں کو ڈبو کر صفحہ ہستی سے مٹا دے گی۔ جنگلات میں لگنے والی آگ ایک معمول بن گیا ہے۔ جنگلی حیات کی کئی نسلیں معدوم ہو جاتی جا رہی ہیں۔ سمندروں کی تیزابیت بڑھ رہی ہے جس سے بہت سی آبی حیات بھی مٹ رہی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ اس کرّے پر موجود منافع کے پجاری زمین کے پھیپھڑے کہلانے والے ایمازون کے جنگلات کو کاٹ کر آبادکاری اور صنعتکاری کرنے کے نعرے لگا چکے ہیں تاکہ وہاں منافع بخش فصلوں (کیش کراپس) کو اگایا جا سکے۔

گرم ہوتے سیارے کے مختلف خطوں پر ان سب عوامل کے اثرات مختلف ہیں۔ تاہم تمام براعظموں کے لیے یہ ایک مشترک آفت ہے۔ میانمار (برما)، لاؤس، ویت نام، کینیا، جنوبی سوڈان، پاکستان، بھارت اور کمبوڈیا جیسے ایشیائی اور براعظم افریقہ کے ممالک شدید گرمی کی لپیٹ میں ہیں۔ جبکہ امریکہ کے ساحلی شہر نیو یارک، میامی اور سان فرانسسکو طوفانی بارشوں اور سیلابوں کی زد میں ہیں۔ کیلی فورنیا، ایروزونا اور مغربی ریاستیں خشک سالی کا شکار ہیں۔ اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق خشک سالی 2030ء تک ستر کروڑ افراد کو بے گھر کر دے گی۔ اسی طرح یورپ کا جنوبی حصہ اٹلی، سپین اور یونان بڑھتے ہوئے درجہ حرارت کی زد میں ہے۔ جرمنی اور فرانس بھی سیلابی صورت حال سے دوچار ہیں۔ برطانیہ اور آئرلینڈ خشک سالی سے متاثر ہیں۔ بیلجیم اور نیدرلینڈز جیسے ممالک بھی طوفانوں کی آفت سے نہیں بچ پائیں گے۔

جنوب ایشیا میں بھارت پہلے ہی اس کیفیت میں گرفتار ہے۔ اس کی 42 فیصد زمین خشک سالی کا شکار ہے۔ بڑھتی ہوئی گرمی اس کے وسیع حصے کو ریگستان بنا دے گی۔ اگر منصوبہ بند معیشت کے تحت اس آفت کو حل نہ کیا گیا تو اس کے تباہ کن معاشی، سماجی اور سیاسی اثرات ہوں گے۔ تمام سماجی ڈھانچہ ڈھیر ہو جائے گا۔ زراعت برباد ہو جائے گی۔ انسانی تاریخ کی سب سے بڑی ہجرتیں عمل میں آئیں گی اور تہذیب کا تانا بانا منتشر ہو جائے گا۔

منڈی کی آزاد معیشت نے محض استحصال کو ہی جنم نہیں دیا بلکہ پورے ایکو سسٹم کو تہس نہس کر دیا ہے۔ آٹھ ارب لوگوں کی ثقافت اور نسل انسان کی بقا کو ایک سنجیدہ خطرہ درپیش ہے۔ ریاستیں پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے آگاہی مہمات چلا کر عوام پر زور دے رہی ہیں کہ زیادہ سے زیادہ درخت لگائے جائیں تاکہ گرمی کی حدت میں اضافے کو روکا جا سکے۔ بڑی ہوشیاری سے اپنی ذمہ داری کو عوام کے کندھوں پر ڈالا جا رہا ہے۔ جبکہ دوسری طرف یہی ریاستیں زرخیز زمینوں کو برباد کر کے نئی ہاؤسنگ سوسائٹیوں کو این او سی جاری کرتی جا رہی ہیں۔ ہر دس فٹ کے فاصلے پر بلند و بالا عمارتوں کے نقشے پاس کیے جا رہے ہیں۔ منصوبہ بندی سے عاری انہی بے ہنگم تعمیرات میں گرم ہوا پھنس کر رہ جاتی ہے۔ پھر ان پر ہزاروں مربع فٹ لگا شیشہ اور کنکریٹ سورج کی حرارت کو دگنا کرنے کا کام انجام دیتا ہے۔ سڑک پر چنگھاڑتی ہوئی گاڑیوں میں جلنے والے تیل اور بجلی گھروں میں کوئلے کا بے دریغ استعمال کاربن پیدا کرنے کا بڑا ذریعہ ہے۔

اس صورت حال میں گلوبل وارمنگ کے متعلق ممالک کے درمیان ہونے والے معاہدات کے نتائج کیا ہیں؟ سب سے زیادہ گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج والا کون سا ملک اس اخراج کو کم کر پایا ہے؟ کون سا ایسا ملک ہے جو گلوبل وارمنگ کا باعث بننے والی گیسوں کے اخراج پر پابندی لگا کر ملکی انڈسٹری کو متاثر کر سکتا ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام معیشت کے پاس اس کرّے کو بچانے کا کوئی حل موجود نہیں ہے۔ ایک سوشلسٹ منصوبہ بند معیشت ہی توانائی، پیداوار اور کھپت کے ماحول دوست ذرائع تلاش کر سکتی ہے اور انہیں بروئے کار لا سکتی ہے۔ ایک ایسی معیشت جس کا مقصد نہ منافعوں کا حصول ہے، نہ انفرادی بقا کے گھٹیا نظریے کی حمایت۔ بلکہ اس کا مقصد انسان کی اجتماعی ترقی اور فلاح ہے۔ اب سوال محض وسائل کی از سر نو تقسیم کا نہیں بلکہ اب سوال اس سیارے کی بقا اور اس پر موجود زندگی کے تحفظ کا ہے۔ آخری تجزیے میں آزاد منڈی کی معیشت خود اپنے تضادات میں پھنس چکی ہے۔ اس کو کسی یوٹوپیائی نظریے یا اخلاقی قوانین کی دوہائی دے کر نہیں توڑا جا سکتا۔ سوشلسٹ انقلاب کا آہنی ہتھوڑا ہی یہ تاریخی فریضہ انجام دے سکتا ہے جو وقت اور حالات کی ناگزیر ضرورت ہے۔

5 جولائی کا شب خون، ایک تاریخی تناظر میں

تحریر: الیاس خان

کہتے ہیں تاخیر سے مرتب ہونیوالی تاریخ زیادہ مستند ہوتی ہے۔ کیونکہ حکمران طبقے کے حاشیہ بردار اور بکاؤ ضمیر فروش دانشور حقائق چھپا کر اور اصل حالات و واقعات کو مسخ کر کے قلم زن کرتے ہیں تاکہ حکمران اشرافیہ اور ان کے نظام کے مفادات کا تحفظ کیا جائے۔ لیکن خوشبو اور سچ صدا چھپ نہیں سکتے۔ لہٰذا ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ماضی کے چھپائے اور مسخ کیے گئے حقائق اور واقعات اپنی اصل اور حقیقی شکل میں منظر عام پر آجاتے ہیں۔

پاکستان کی سیاسی وسماجی تاریخ میں 5 جولائی 1977ء کو بزدل ترین، جھوٹے اور منافق جنرل ضیا الحق نے منتخب وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو امریکی سی آئی اے کی ایما پر معزول کر کے قومی اسمبلی توڑ دی۔ بعد ازاں 4 اپریل 1979ء کو بھٹو کو ایک جھوٹے مقدمہ قتل میں بذریعہ عدالت سولی پر چڑھا دیا۔ یہ ایک ہی سلسلہ کی وارداتیں تھیں۔ لیکن اس صورتحال کا عمیق جائزہ ہی حقائق کا پردہ چاک کرے گا۔ بدیں وجہ 1970ء کی دہائی میں ایشیا بالخصوص پاکستان، افغانستان اور ایران وغیرہ میں ابھرتی ہوئی سوشلسٹ انقلاب کی تحریکوں اور بالعموم خطہ عرب سمیت پوری دنیا میں پھیلی سامراج مخالف بغاوتوں کا تجزیہ ضروری ہے۔ جنہوں نے نہ صرف مغربی سامراج بلکہ سوویت یونین کی سٹالنسٹ بیوروکریسی کے بھی کان کھڑے کر دیئے تھے۔

1968-69ء میں پاکستان میں ایوب خان آمریت کی انتہائی استحصالی سرمایہ دارانہ پالیسیوں کے خلاف محنت کشوں کی وسیع انقلابی تحریک پھوٹ پڑی تھی۔ اس سے ایک سال قبل ہی 30 نومبر 1967ء کو ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی گئی تھی اور پارٹی کا تاسیسی پروگرام (منشور) تیار کر کے محنت کش طبقے کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ پاکستان پیپلز پارٹی حصول اقتدار کے بعد پاکستان میں سرمایہ دارانہ نظام معیشت اکھاڑ کر سوشلسٹ معیشت کا نفاذ کرے گی۔ نیز تمام ریاستی امور اور ملکی انتظام و انصرام محنت کش طبقہ کے تربیتی یافتہ اجتماعی ہاتھوں میں دے کر استحصال سے پاک معاشرے کا قیام عمل میں لائے گی اور امریکہ اور دیگر سامراجی قوتوں سے پاکستانی سیاست اور معیشت کو آزاد کرائے گی۔ پیپلز پارٹی کی بنیادی دستاویز جیسا ریڈیکل پروگرام پاکستان میں کمیونسٹ جماعتوں سمیت کسی اور سیاسی جماعت کے پاس نہیں تھا۔ چنانچہ اس دلکش منشور نے ذوالفقار علی بھٹو کو قائد عوام بنا دیا اور انتہائی قلیل عرصہ میں پیپلز پارٹی ملک کی مقبول ترین جماعت بن کر ابھری۔ 1970ء کے عام انتخابات میں مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی بھاری اکثریت سے الیکشن جیت گئی اور ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے وزیر اعظم بن گئے۔ لیکن پھر حصول اقتدار کے بعد تحریک کو جمہوری رد انقلاب کی نذر کرنے کی ایک علیحدہ اور طویل داستان ہے۔ عوامی دباؤ کے پیش نظر ذوالفقار علی بھٹو نے کچھ اصلاحی اقدامات کیے۔ لیکن سوشلسٹ انقلاب کے ٹھوس عملی اقدامات اٹھانے سے گریز ہی کیا گیا۔ حالانکہ طلبہ و نوجوانوں کی کثیر تعداد سمیت پاکستان کے محنت کش عوام پیپلز پارٹی کے سوشلسٹ انقلابی پروگرام کے حمایتی تھے اور دامے درمے قدمے سخنے بھٹو کے ساتھ کھڑے تھے اور اسے اپنا مسیحا اور نجات دہندہ سمجھتے تھے۔ پاکستان میں اگر سماج کی سوشلسٹ تعمیر نو کا عمل آگے بڑھتا تو یہ انقلابی چنگاریاں پورے خطے میں پھیل سکتی تھیں۔ کیونکہ بیشتر ممالک میں سوشلسٹ تحریکیں پہلے سے مصروف عمل تھیں۔ بہر حال ذوالفقار علی بھٹو کے تحت پیپلز پارٹی کی اصلاح پسندانہ روش کی وجہ سے یہ انقلابی عمل ایک تعطل اور زوال پذیری کا شکار ہو گیا اور سامراجی قوتیں خطے میں اپنے مفادات بچانے کے لیے سازشوں میں سرگرم عمل ہو گئیں۔ جن میں موقع ملتے ہی پیپلز پارٹی حکومت کا دھڑن تختہ اور ذوالفقار علی بھٹو کا قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کیا گیا۔

یوں تو جنرل ضیا الحق نے اپنی عسکری زندگی میں کئی گھناؤنے اور ناقابل معافی جرائم سرزد کیے جن کی فہرست کافی طویل ہے۔ مگر 5 جولائی 1977ء کو سرزد کیے گئے تاریخی جرم اور بعد کے اقدامات نے پاکستانی معاشرے میں مذہبی بنیاد پرستی، فرقہ واریت اور لسانی و علاقائی تعصّبات کے جو بیج بوئے اس کا خمیازہ تاحال یہ سماج بھگت رہا ہے۔ انقلابی نوجوانوں سے 1968-69ء کی سوشلسٹ تحریک کا انتقام لینے کے لیے انہیں کلاشنکوف اور ہیروئن جیسے 'تحائف' سے متعارف کروایا گیا۔ جنرل ضیا الحق کی غلیظ اور سیاہ کرتوتوں نے یہاں کے عوام کے لیے اذیت ناک صورتحال پیدا کر دی۔ اس سے قبل اسی ضیا الحق (جو اس وقت بریگیڈیئر تھا) نے امریکی ایجنٹ اردن کے شاہ حسین کے کہنے پر اس عسکری لشکر کی قیادت کی تھی جس نے اردن کے سرحدی علاقوں میں فلسطینی حریت پسندوں کا وسیع قتل عام کیا تھا۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ کس قدر رجعتی اور منافق انسان تھا۔

اسی عرصے میں 20 نومبر 1979ء کو مسلمانوں کے مقدس ترین مقام حرم پاک پر چھ سو بنیاد پرست سعودی باغیوں نے بذریعہ اسلحہ قبضہ کر لیا اور مطالبہ کیا کہ امریکہ و دیگر مغربی ممالک کو تیل کی سپلائی فوری بند کی جائے۔ نیز عرب کی

سرزمین سے امریکہ سمیت تمام غیر ملکی ملٹری اور سول ماہرین کو نکالا جائے۔ اس واقعے کے فوری بعد سعودی عرب کے شاہ خالد اور شاہی خاندان کے دیگر اہم افراد ملک سے فرار ہو گئے۔ شاہ خالد نے بیرون ملک سے بیان جاری کیا کہ باغیوں کو بیروت کی عرب سوشلسٹ ایکشن پارٹی کی مدد حاصل ہے۔ جبکہ امام خمینی نے بیان دیا کہ یہ قبضہ امریکہ اور اسرائیل نے مل کر کروایا ہے۔ المختصر سعودی حکمران اشرافیہ نے فرانس اور پاکستان سے عسکری مدد حاصل کی۔ چنانچہ فرانسیسی 'GIGN' یونٹ (سپیشل فورسز) اور جنرل ضیا الحق کے بھیجے ہوئے کمانڈوز کے ذریعے خاصے خون خرابے کے بعد یہ محاصرہ ختم کروایا گیا۔ کئی باغیوں کو دوران آپریشن قتل کر دیا گیا۔ جو گرفتار ہوئے انہیں بغیر مقدمہ چلائے پھانسیاں دے دی گئیں۔ اس آپریشن کے بعد ہی شاہ خالد وغیرہ واپس آئے۔ اس وقت سعودی شاہی خاندان کو یہ اطلاعات بھی موصول ہو رہی تھیں کہ سعودی فوج میں بھی بڑے پیمانے پر بغاوت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ آپریشن کی کامیابی کے بعد فوج میں بڑے پیمانے پر تطہیر کا عمل شروع ہو گیا۔ بہرحال یہ واقعات اس وقت خود خلیجی ریاستوں میں پھیلے سامراج مخالف جذبات کا پتا دیتے ہیں۔

1960ء اور 1970ء کی دہائیوں میں مغربی سامراج اور اس کی پروردہ مقامی حکمران اشرافیہ کو وسیع پیمانے پر پھیلی عوامی بے چینی اور سوشلسٹ تحریکوں کے خطرات کا ادراک تھا۔ ان رجحانات کی سرکوبی کے لیے انہوں نے نہ صرف یہاں بلکہ پوری دنیا میں بنیاد پرست قوتوں کو پروان چڑھانے کی پالیسی اختیار کی۔ بھٹو حکومت کے خلاف پاکستانی قومی اتحاد (پی این اے) کی تشکیل، نام نہاد نظام مصطفیٰ کی تحریک اور 1977ء کے انتخابات میں دھاندلی کا شور اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔ شواہد بتاتے ہیں کہ یہ سب 75-1974ء سے ہی متذکرہ بالا امریکی ایجنڈا کا حصہ تھا۔ اسی دوران ایران میں سامراجی کٹھ پتلی شہنشاہ کے خلاف تودہ پارٹی (کمیونسٹ پارٹی آف ایران) کے انقلابیوں نے زبردست تیاری کے ساتھ انقلابی تحریک کا آغاز کر دیا جس کے اثرات عرب ممالک میں بھی مرتب ہو رہے تھے جہاں پہلے سے سوشلسٹ بعث پارٹی کی برانچیں اور کمیونسٹ پارٹیاں سرگرم عمل تھیں۔ دوسری طرف افغانستان میں خلق اور پرچم دھڑوں پر مبنی پی ڈی پی اے، جو انقلابی ایجنڈے کے تحت داؤد خان کی حکومت کے ساتھ برسر پیکار تھی، کو بھی افغان فوج کے اکثریتی حلقوں کی حمایت حاصل ہو رہی تھی۔ جو بعد ازاں ثور انقلاب پر منتج ہوئی۔

ایران میں تودہ پارٹی کی قیادت کی مصالحت اور مرحلہ واریت پر مبنی پالیسیوں کی وجہ سے امریکی و فرانسیسی سامراج کو موقع ملا کہ شہنشاہ ایران کی معزولی کے تناظر میں امام خمینی (جو فرانس میں جلاوطنی گزار رہا تھا) کی آمد اور اقتدار پر قبضے کی راہ ہموار کی جائے۔ اس سلسلے میں اسے ایرانی عوام کا رہبر اور مسیحا بنا کر ایران روانہ کر دیا گیا جبکہ شہنشاہ ملک چھوڑ کر فرار ہو گیا (فرانس چلا گیا)۔ یوں ایران کو اس بنیاد پرستی کی وحشت و درندگی کے حوالے کر دیا گیا جس کے خلاف سارے مغربی سامراجی آج بظاہر برسرپیکار نظر آتے ہیں۔

امام خمینی نے اقتدار پر قبضے کے بعد تودہ پارٹی کے خلاف ہی کریک ڈاؤن شروع کر دیا۔ جس کے تقریباً دس ہزار کیڈروں کا قتل عام پہلی فرصت میں کیا گیا۔ تودہ پارٹی کے سیکرٹری جنرل نورالدین کیانوری کو اذیت ناک سزائیں دی گئیں اور قومی ٹیلیوژن پر اعتراف جرم کروایا گیا۔ بعد ازاں وہ نظر بندی پر مبنی قید میں فوت ہوا۔

اپریل 1978ء میں افغانستان میں نور محمد ترکئی کی قیادت میں انقلاب برپا ہونے کے بعد انتہائی ترقی پسندانہ و عوام دوست اقدامات کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ ثور انقلاب کی پہلی سالگرہ کے موقع پر قائد انقلاب نور محمد ترکئی نے دنیا بھر کے محنت کشوں کو پیغام دیا جس میں انہوں نے ثور انقلاب کو بالشویک انقلاب سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ صرف افغانستان کا نہیں بلکہ پوری دنیا کے مظلوموں اور استحصال زدہ عوام کا انقلاب ہے۔ یہ سارا عمل بھی نہ صرف امریکہ بلکہ سوویت افسر شاہی کی آنکھوں میں کھٹک رہا تھا۔ ایسی سامراج دشمن تحریکوں کی کامیابی دنیا بھر کے محنت کشوں اور نوجوانوں کے شعور کو جھنجوڑ سکتی تھی۔ چنانچہ پہلے اکتوبر 1979ء میں ثور انقلاب کے قائد نور محمد ترکئی کو سوویت 'کے جی بی' نے ایک سازش کے ذریعے صدارتی محل میں قتل کرایا۔ پھر دسمبر 1979ء میں انقلاب کے دوسرے قائد حفیظ اللہ امین کو اس کے بیٹے و سکیورٹی گارڈز سمیت سوویت کمانڈوز نے آپریشن 'Storm 333' کے تحت تاج بگ محل پر حملہ کر کے قتل کر دیا۔ دو دن بعد سوویت افواج باقاعدہ افغانستان میں داخل ہو گئیں۔ جس کے بعد سی آئی اے کو وہ رجعتی ڈالر جہاد شروع کرنے کا موقع مل گیا جس میں ضیا آمریت کا بھیانک کردار کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔

1970ء کے اواخر کے چند سالوں میں رونما ہونے والے یہ واقعات آج کے انقلابی نوجوانوں کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں اور اپنے اندر اہم تاریخی اسباق سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان سے پتا چلتا ہے کہ اس نظام کے کاسہ لیس دانشوروں کی مرتب کردہ تاریخ کے برعکس ہمارا ماضی سرمایہ داری اور سامراج کے خلاف کیسی شاندار جدوجہدوں اور تحریکوں سے عبارت ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ پیپلز پارٹی سے لے کر تودہ پارٹی تک مصالحت، اصلاح پسندی اور مرحلہ واریت پر مبنی پالیسیوں کی ناگزیر ناکامیوں اور خوفناک مضمرات کو واضح کرتے ہیں۔ مزید برآں ان سے پتا چلتا ہے کہ اپنے نظام کو بچانے کے لیے یہ سامراجی اور ان کے گماشتہ حکمران انتہائی زہریلی بنیاد پرستی کے استعمال سمیت کس قدر بے رحمی اور وحشت پر اتر سکتے ہیں اور ناکام انقلابات کا خمیازہ نسلوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ضیا الحق نے 5 جولائی 1977ء کو جس رد انقلابی عمل کا آغاز کیا تھا اسے بعد کی نام نہاد جمہوری و آمرانہ حکومتوں نے کسی نہ کسی شکل میں آگے ہی بڑھایا ہے۔ ضیا جسمانی طور پر مر گیا لیکن اس کے سیاہ نظریات آج بھی اس ریاست اور اس کی حکومتوں کی پالیسیوں اور طرز عمل میں زندہ ہیں اور اس ملک کے محکوم عوام کی زندگیوں کو اجیرن کیے ہوئے ہیں۔ اگر سامراج اور استحصالی طبقات اپنے مفادات کے لیے تمام تر داخلی اختلافات کے باوجود ایک ہیں تو دنیا بھر کے استحصال زدہ محنت کش عوام کو بھی یکجا ہونا ہوگا۔ اور ماضی کی جدوجہدوں کی کمزوریوں اور خامیوں سے سیکھتے ہوئے سامراجی سرمایہ داری کے خلاف لڑائی کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانا ہوگا۔ اس کے علاوہ نجات کا کوئی راستہ موجود نہیں۔

DAWN

KARACHI

MARTIAL LAW IS PROCLAIMED: ELECTIONS IN OCTOBER NEXT

GenZia is CMLA: President stays

Top PPP, PNA leaders in protective custody

Sections of constitution under suspension

Four-man Military Council at Centre

ML Administrators for provinces

Political activities banned in country

Front page of Dawn newspaper July 6, 1977

نیا لیبر کوڈ

محنت کشوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کی نئی واردات

قمر الزماں خاں

سماجوں کو منظّم اور مربوط رکھنے کے لئے ضوابط کی ضرورت ہوتی ہے۔ سماج کے ہر شعبے میں مختلف قسم کے قوانین کے مطابق حرکت زندگی رواں دواں دکھائی دیتی ہے۔ بظاہر یہ قوانین اور ضابطے سماجی نظم کی ضرورت نظر آتے ہیں اور یہ بات کافی حد تک درست بھی ہے۔ لیکن یہ بات بنیادی اہمیت رکھتی ہے کہ کسی سماج کی طبقاتی ساخت کیا ہے اور یہ کہ وہاں کی آبادیوں کے مختلف حصوں کی روزمرہ زندگی کے لئے ضابطے، اصول و قوانین مرتب کون کر رہا ہے۔ قوانین کا مجموعہ اپنے معرض وجود میں آنے سے پہلے بھی کسی سماجی گروہ کے مفادات کی ناگزیر ضرورت ہوتا ہے۔ اسی لئے اسے بنایا اور نافذ کیا جاتا ہے اور عمل درآمد کرانے کے لئے ایک پورا ڈھانچہ استوار کیا جاتا ہے جو کئی اداروں پر مشتمل ہوتا ہے۔

ایک قانونی نظام جو کسی سماجی گروہ یا پرت کے مخصوص معاشی، سیاسی اور سماجی مفادات کے لئے قائم کیا جاتا ہے، دراصل اپنے عہد کے پیداواری رشتوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ موجودہ نظام، جس کو سرمایہ داری یا منڈی کی معیشت کہا جاتا ہے، کا بنیادی وصف سماج کے بڑے حصے کی قوت محنت سے ایسی پیداوار حاصل کرنا رہا ہے جس کا بڑا حصہ سرمایہ دار کے پاس چلا جائے اور ایک نسبتاً قلیل حصہ (مزدوری یا اجرت کی شکل میں) محنت کے تسلسل کو قائم رکھنے پر خرچ کیا جائے۔ اس عمل سے دو طبقات پیدا ہوتے ہیں۔ محنت کرنے والا طبقہ اور محنت غصب کرنے والا طبقہ۔ لیکن طبقاتی لوٹ اور استحصال کے اس نظام کو قوانین اور ضوابط کی شکل دے کر ریگولیٹ کیا جاتا ہے اور اوٹ بھی فراہم کی جاتی ہے۔ تاہم آخری تجزیے میں طبقاتی نظام کے قوانین، ضابطوں اور نظم و نسق کا بنیادی جوہر استحصال (محنت کشوں کی پیدا کردہ قدر زائد کو ضبط کرنے کا عمل) کو قائم و برقرار رکھنا ہی ہوتا ہے۔ اس ضمن میں آنے والی ہر ممکنہ مزاحمت، رکاوٹ اور مشکل کو ختم کرنا ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے جن میں سرفہرست پولیسنگ اور عدل و انصاف کے ادارے ہوتے ہیں۔

اس نام نہاد نظام عدل و انصاف کے بنیادی اصولوں اور قوانین کو قانون ساز اسمبلیاں یا پارلیمنٹیں تشکیل دیتی ہیں۔ جو پھر خود اس نظام کے حاکموں، ان کے نمائندوں یا اس سے فیض یاب ہونے والے دوسرے سیاسی گروہوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ لہٰذا قوانین، انہیں بنانے والے ایوانوں اور ان پر عملدرآمد کروانے والے اداروں کی تمام کڑیاں باہم پیوست ہوتی ہیں۔ کسی بھی طبقاتی سماج میں قانون، انصاف اور عدلیہ کی غیر جانبداری بنیادی طور پر ایسا بہکاوا یا دھوکہ ہوتا ہے جس کے مختلف پہلو لوگوں کی اکثریت کو سراب میں مبتلا کیے رکھتے ہیں۔ یہ محنت کش عوام کی مزاحمت کی راہ میں بھی حائل ہوتے ہیں اور انہیں ظلم و استحصال کرنے والے افراد اور اداروں سے ہی انصاف کا طلب گار بھی بنائے رکھتے ہیں۔

لیکن ایک اور عمل بھی ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے۔ جیسا کہ مارکس نے کہا تھا کہ ''معلوم تاریخ طبقاتی کشمکش کی تاریخ ہے۔'' لہٰذا کبھی کبھی اس کشمکش میں معمول سے ہٹ کر منظر نامے بھی سامنے آتے ہیں۔ جیسا کہ تاریخ کے غیر معمولی ادوار میں محنت کش طبقے کی تنظیموں کی مزاحمت اور دباؤ کے باعث کبھی ایسے قوانین بھی بنتے ہیں جو حکمران طبقے کی خواہشات کے برخلاف ہوتے ہیں۔ لیکن حکمران اپنی کسی بھی ہزیمت کو کبھی نہیں بھولتے اور اپنی ہر پسپائی کے اثرات و مضمرات کو الٹنا چاہتے ہیں۔ خاص طور پر نظام کی زوال پذیری کے تحت ماضی کے طرز پر شرح منافع حاصل نہ کر پانے کی وجہ سے سرمایہ داری ناگزیر طور پر مزدوروں کی اجرتوں، مراعات اور سہولیات پر حملے کرتی ہے۔ سرمایہ داری کے گہرے عالمی و ملکی بحران کے تحت ایسا ہی ایک شدید حملہ دنیا بھر میں نئے لیبر کوڈ کی شکل میں کیا جا رہا ہے۔

اپنے نام کے برعکس سامراجی پالیسیوں کی نمائندہ 'انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن' کی جانب سے تیار کیا گیا نیا لیبر کوڈ ایک مجوزہ کمپاؤنڈ قانون ہے جو ماضی کے دو درجن سے زائد مجموعہ قوانین کو اس انداز میں بدلنا چاہتا ہے کہ ان میں سے مزدوروں کو ملنے والے حقوق و مراعات کو نکال کر کھوکھلا کر دیا جائے۔ اس لیبر کوڈ میں ان تعریفوں کو بدل کر رکھ دیا گیا ہے جو ماضی کے قوانین کے ذرائع یعنی ٹریڈ یونینز ایکٹ 1926ء، صنعتی روزگار (اسٹینڈنگ آرڈرز) ایکٹ 1946ء، صنعتی تنازعات ایکٹ 1947ء اور فیکٹریز ایکٹ 1934ء کے ذریعے وضع کی گئی تھیں۔ بعد ازاں پاکستان میں تقریباً 200 لیبر قوانین بنائے گئے جن میں بھٹو دور میں محنت کش طبقے کی تحریک کے تحت لیبر قوانین کی تشکیل یا ترمیم بھی شامل ہے۔ لیکن یہ قوانین بھی ماضی کے قوانین کی روشنی میں وضع کیے گئے تھے جن میں زیادہ اہم 1934ء کا قانون ہے۔ ان قوانین کی تشریحات کو موجودہ شکل میں لانے میں 90 سال کا طویل عرصہ لگا ہے۔ اگرچہ ماضی میں بھی کوئی صنعتی آرڈیننس یا ایکٹ بہت مزدور دوست نہیں تھا بلکہ مجموعی طور پر ان قوانین کا مقصد مزدوروں کو بہلانا اور بوقت ضرورت کچھ دے دلا کر صنعتی امن کو قائم رکھنا تھا تاکہ پیداواری عمل (یعنی سرمایہ داروں کی منافع

نیا لیبر کوڈ

خوری) میں کوئی بڑا خلل نہ آئے۔ اس کے باوجود مزدوروں کو کم از کم قانونی طور پر کچھ نہ کچھ سہولت ضرور حاصل تھی۔ کیونکہ پچھلی کچھ دہائیوں میں مزدور تحریک کی پسپائی اور بحران کے ساتھ بیشتر لیبر قوانین ویسے ہی محض کتابوں کی زینت بن کے رہ گئے ہیں۔ لیکن اب محنت کش طبقے کے انتہائی چھوٹے سے منظّم حصے کو حاصل قانونی حقوق بھی چھیننے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ نیولبرل سرمایہ داری ماضی کی وہ تمام حاصلات واپس لینے کے درپے ہے جو محنت کشوں نے ڈیڑھ دو سو سال کی شدید جدوجہد سے حاصل کی تھیں۔ خاص طور پر بالشویک انقلاب 1917ء کے بعد کے عرصے میں، جب ہر طرف سوشلسٹ انقلاب کی کاوشیں اور مزدور تحریکیں ابھر رہی تھیں، سامراجی طاقتوں کو مزدوروں کی بہت سی مانگیں ماننا پڑیں اور بہت سی اصلاحات کے تحت قدر زائد میں سے کچھ اضافی حصہ محنت کش طبقے کو واپس لوٹانا پڑا۔ اسی قسم کے صورتحال دوسری عالمی جنگ اور پاکستان میں 1968-69ء کے بعد پیدا ہوئی۔ لیکن اب ماضی کی ان ساری پیش رفتوں کو الٹنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

نئے مجوزہ لیبر کوڈ کا سرسری جائزہ لیں تو اس قانون میں مزدور اور آجر کی معروف تعریف ہی بدل دی گئی ہے اور اسے توڑ موڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ جس میں مالکان کے مفادات کو قانونی تحفظ فراہم کرنے کے لئے مختلف درجہ بندیاں کی گئی ہیں اور ایسی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں جن سے حقیقی آجروں کو پردوں میں رکھا جا سکے، وہ براہِ راست قانونی کاروائی سے بچ نکلیں اور مزدور اسی تذبذب میں رہیں کہ ان کا آجر کون ہے، کس سے تنخواہ لینی ہے اور کسی مسئلے کی صورت میں کس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنی ہے۔ اس مقصد کے لئے پرنسپل، آکوپائیر اور کنٹریکٹر وغیرہ جیسے الفاظ کو استعمال کیا گیا ہے۔ اس قانون کے باب 1.1 سیکشن 2 میں تمام سرکاری دفاتر کے محنت کشوں سے ٹریڈ یونین کا حق چھین لیا گیا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے یہ لوگ لیبر لا کے تحت ہی اپنی یونین رجسٹر کراتے تھے۔ مگر اب اس قانون کے تحت سرکاری ملازمین پر لیبر لا کا کوئی بھی سیکشن لاگو نہیں ہوگا۔ جس سے وہ خود بخود یونین سازی کے عمل سے باہر ہو جائیں گے۔ اسی طرح اس قانون کے تحت ایک سرمایہ دار یا آجر ذمہ دار نہیں ہوگا بلکہ ذمہ داری سب کنٹریکٹر ایجنسی، ا؟ کوپائیر اور پرنسپل وغیرہ پر تقسیم ہو گی۔ نئے لیبر کوڈ کے ذریعے ٹھیکے داری نظام کو باضابطہ، جدید اور زیادہ استحصالی شکل دی جا رہی ہے۔ یہاں پر ایجنسی ایمپلائمنٹ کو بھی لے کر آیا جا رہا ہے۔ جس میں محنت کش کسی روزگار ایجنسی یا ٹھیکیدار وغیرہ کے ذریعے کسی ادارے میں روزگار حاصل کر سکے گا اور اس ایجنسی (ٹھیکے دار) کی مرضی سے ہی کسی فیکٹری وغیرہ میں کام کرے گا۔ یعنی کسی مشروبات فیکٹری کے مزدور کو ٹھیکیدار چاہے تو سیمنٹ فیکٹری یا کسی بھی جگہ بھیج سکے گا۔ اس طرح بالکل کچی لیکن قانونی طور پر جائز نوکری میں وہ اجیر یا مزدور ہر اس سہولت یا حق سے محروم ہو جائے گا جو محنت کشوں نے دہائیوں کی جدوجہد سے حاصل کیا ہے۔ اسی قسم کے استحصالی شقیں بھٹہ مزدوروں کے حوالے سے بھی شامل کی گئی ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ سب انتہائی پر فریب طریقے سے کیا جا رہا ہے اور بظاہر مزدور دوست نظر آنے والی شقیں عملاً مزدوروں کی زندگیوں کو مزید اجیرن کر دیں گی۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ منافع میں پانچ فیصد کا حق، دیگر بونسز وغیرہ کے ساتھ ساتھ مستقل ملازمین کہلانے والے مزدوروں کو میسر تقریباً تمام سہولیات اور حقوق بتدریج ختم کر دیئے جائیں گے۔ یوں دراصل ٹھیکے داری نظام ماضی کے 'پرنسپل ایمپلائیر' یعنی ادارے کی جگہ لے لے گا۔ اسی طرح پچھلے قوانین کے تحت یونین بنانے کے لئے کم از کم مزدوروں کی تعداد کو پانچ سے بڑھا کر 20 کر دیا گیا ہے۔ یعنی 20 یا فیکٹری کے 5 فیصد ملازم ہی مل کر یونین بنا سکتے ہیں۔

سی بی اے (منتخب اجتماعی سودا کاری ایجنٹ) کی طاقت کو بھی کم کیا گیا ہے اور کوئی بھی یونین سی بی اے کے بغیر فیکٹری مالکان سے مطالبات وغیرہ پر بات کر سکتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ کسی متحرک اور انتظامیہ کے لئے ناپسندیدہ سی بی اے یونین کو غیر موثر کرنے کے لئے 'ڈمی' یا 'پاکٹ یونین' کو بروئے کار لایا جائے گا۔ پھر سی بی اے کس کھاتے میں رہے گی؟ لیبر یونین کو کنٹرول میں رکھنے کے لئے قانون بدلا جا رہا ہے۔ نئے لیبر کوڈ کے مطابق کسی بھی یونین کے پانچ لوگ مل کر درخواست دیں تو لیبر ڈیپارٹمنٹ سے یونین کی رجسٹریشن منسوخ بھی ہو سکتی ہے۔ مطلب اب سب کچھ انتظامیہ کے ہاتھ میں ہو گا کہ کس یونین کو برقرار رکھنا ہے اور کس یونین کی رجسٹریشن کو اپنے کنٹرول کے ورکرز کے ذریعے ختم کرانا ہے۔

اسی طرح لیبر کورٹس کے اختیارات کو محدود کرتے ہوئے زیادہ تر اختیارات لیبر ڈیپارٹمنٹ اور انسپکٹر لیبر کو دے دیئے گئے ہیں۔ مزدور اور آجر کے درمیان کسی تنازعے پر ایک کمیٹی بنی گی جو کہ اس پر فیصلہ کرے گی۔ اس کا مطلب ہے کہ تنازعات بغیر کسی حل طویل عرصے کے لئے سرد خانے میں ڈال دیئے جائیں گے اور مزدور ذلیل وخوار ہوتے رہیں گے۔ اس ضمن میں لیبر کورٹ بھی تنازعہ کمیٹی، جو کہ لیبر ڈیپارٹمنٹ وغیرہ پر مشتمل ہو گی، کی سفارشات پر ہی فیصلہ کرے گی۔ لیبر کورٹ کے جج جو پہلے کم از کم ڈسٹرکٹ جوڈیشری سے لیے جاتے ہیں' اب ان کی نامزدگی حکومت کر سکے گی اور لیبر ڈیپارٹمنٹ کے کسی بھی افسر کو، جس نے لا کیا ہو اور پانچ سال سروس ہو، لیبر کورٹ کا جج لگایا جا سکتا ہے۔ سرمایہ داروں اور ٹھیکے داروں کے پے رول پر چلنے والا لیبر ڈیپارٹمنٹ کیسا انصاف کرے گا؟ یہ کوئی پیچیدہ بات نہیں ہے۔ شکایت کنندہ مزدور کو انصاف ملنا مزید محال بلکہ ناممکن ہو جائے گا۔ یوں لیبر کورٹ کو کنٹرول یا غیر موثر کرنے کے قوانین وضع کیے گئے ہیں۔

صوبوں میں مرحلہ وار نافذ ہونے والے اس لیبر کوڈ میں کسی بھی قسم کی تبدیلی یا بہتری کے لئے ایک کمیٹی بنے گی جس میں تقریباً 16 حکومتی اداروں کے سیکرٹری وغیرہ ہوں گے اور 4 مزدور رہنما اور 4 ہی آجروں (سرمایہ داروں) کے ممبر ہوں گے۔ اسی مساوات کے مطابق مزدوروں کے متعلق قوانین حکومت کی منشا سے بنیں گے اور تبدیل ہوں گے۔ اس قانون کا سب سے بڑا نقصان مزدور تحریک کو یہ ہوگا ہے کہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں سالہا سال سماعت کے بعد جن معاملات پر فیصلے ہوئے اور قانونی مثال بنے وہ سب غیر موثر ہو کر ردی کی ٹوکری کی نذر ہو جائیں گے۔ اب ایک نیا گھن چکر شروع ہوگا۔ ہر ایشو پر نئے سرے سے اور نئے لیبر کوڈ کی روشنی میں عدالتیں سماعت شروع کریں گی اور پاکستانی عدل وانصاف کے ادارے مزید تیس چالیس سال نئی تشریحات میں مصروف رہیں گے۔ یوں مزدوروں کی دو تین نسلیں انصاف کے نئے تصور کا چہرہ دیکھے بغیر ہی عدالتی در و بام کے چکر کاٹتی رہیں گی۔ یہاں انصاف ملے نہ ملے لیکن حصولِ انصاف کی جدوجہد لاکھوں کروڑوں روپے فیس کا تاوان مانگتی ہے۔ اربوں روپے منافع کمانے والے مالکوں اور ٹھیکے داروں کے لئے وکلا کی بھاری بھرکم فیس ادا کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لیکن مزدور کا ایک ایک روپیہ محنت کے بے رحم بازار میں خود کو بیچ کر حاصل ہوتا ہے۔ یوں فیصلہ پھر سرمائے کے ہاتھ ہی ہوگا۔

اس وقت محنت کشوں کی باخبر اور منظّم پرتوں میں نئے لیبر کوڈ کی تفہیم اور مضمرات پر بحث ہو رہی ہے تاکہ کوئی لائحہ عمل بنایا جا سکے۔ مگر یاد رکھنے والی بات ہے کہ یہ نیا لیبر کوڈ 'انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن' کے تعاون اور مدد سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس ادارے اور اس کی کچھ ذیلی کمیٹیوں میں پاکستان کے ''مزدور نمائندگان'' بھی شامل ہیں۔ مقامی ٹریڈ یونین کی طرح یہ عالمی ادارہ بھی بنیادی طور پر مزدوروں اور مالکان کے مابین مفاہمت کی کوشش پر مبنی کردار کا حامل ہے۔ لیکن تماشہ یہ ہے کہ اس ادارے کی وہ کم سے کم تجاویز بھی پاکستانی سرمایہ دار ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں جو پاکستان کئی دہائیاں پیشتر ہی مختلف کنونشنز پر دستخط کر کے مان چکا ہے۔ پاکستان کے مزدوروں کی قیادت بہت بڑی بڑی فیڈریشنوں اور

کنفیڈریشنوں کے ہاتھوں میں ہے۔ مگر مزدور تحریک کی حالت زار مزدور کی حالت دیکھ کر جانچی جاسکتی ہے۔ موجودہ صورتحال میں جب مزدور تحریک جمود بلکہ تنزلی کا شکار ہے' اس پر حملہ آسان تھا جو اس مجوزہ لیبر کوڈ کی شکل میں کردیا گیا ہے۔ جو اس سے پہلے دنیا میں جہاں پر بھی رائج ہوا ہے وہاں مزدوروں کی حالت مزید پتلی ہی ہوئی ہے۔

اس نئے لیبر کوڈ کے تدارک یا مزاحمت کے لئے سب سے پہلے مزدور تحریک کی نئے سرے سے صف بندی کی ضرورت ہے۔ جو صرف تنظیمی نہیں بلکہ نظریاتی اعتبار سے بھی ہو۔ دنیا میں دو طرح کی مزدور تنظیمیں ہیں۔ ایک وہ جو سرمایہ داری کے نظریات کے تابع ہو کر محنت کا استحصال کرنے والے اداروں اور طبقات کا ڈائریکٹ یا اِن ڈائریکٹ تحفظ کرتی ہیں، ممکنہ طبقاتی جدوجہد کے راستے کی رکاوٹ بنتی رہتی ہیں اور سرمایہ دارانہ پالیسیوں کو قابل قبول بنانے کے لئے دلائل ڈھونڈتی ہیں۔ دوسری قلیل تعداد میں وہ مزدور تنظیمیں ہیں جن کا وجود انقلابی نظریات سے گندھا ہوتا ہے اور وہ سرمایہ داری نظام اور اس کی پالیسیوں کو نسل انسان کی ہلاکت، پسماندگی، غربت اور لاچاری کا باعث سمجھ کر ٹریڈ یونین کی جدوجہد کو نظام کی تبدیلی کی جدوجہد سے منسلک کرتی ہیں۔ ایک انقلابی اور نظریاتی ٹریڈ یونین مزدوروں کے روزمرہ مسائل اور مانگوں کے گرد قانون کے اندر یا باہر جدوجہد کو لازمی استوار کرتی ہے لیکن اس کو اپنا حتمی نصب العین نہیں سمجھتی۔ کسی انقلابی نصب العین کے بغیر طبقاتی جدوجہد چھوٹی چھوٹی مانگوں اور قانونی نکات کے گرد منجمد ہو کر رہ جاتی ہے۔

آج پاکستان کی ہر فیکٹری، کارخانے، ہسپتال، دفتر، سکول اور سرکاری و نجی ادارے میں عملی طور پر مزدور مفلوج و بے بس ہے۔ اس کا بے پناہ استحصال ہو رہا ہے اور اس کی کہیں شنوائی نہیں ہے۔ بیشتر مالکان اپنے اداروں میں دس بیس فیصد کے علاوہ باقی مزدوروں کو پہلے سے ہی ٹھیکے داری نظام کے تحت کم اجرتوں اور بغیر کسی مراعت کے صنعتی غلام بنائے ہوئے ہیں۔ اب نئے لیبر کوڈ کے ذریعے اس صنعتی غلامی کو قانونی شکل دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس کا مقابلہ قانون کے میدان میں بھی کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اصل مقابلہ فیکٹری گیٹ پر کرنا پڑے گا۔ محنت کش طبقے کو ایک سبقت حاصل ہے کہ یہ اپنی عددی قوت اور کام کرنے اور روکنے کی طاقت کے ذریعے ایک قانون کیا، ایک حکومت کیا، پورے نظام کو تہس نہس کر سکتا ہے۔ اور اس نظام کو مٹائے بغیر نہ کوئی قانون اور نہ ہی کوئی ضابطہ جبر و استحصال کے اس وحشیانہ عمل کو روک سکتا ہے۔

جموں کشمیر: تحریک کی ابتدائی فتح اور مستقبل کے چیلنجز

حارث قدیر

پاکستانی زیرانتظام جموں کشمیر میں جاری عوامی حقوق تحریک نے ایک ابتدائی فتح حاصل کی ہے۔ ریاست نے کچھ مطالبات رسمی طور پر تو منظور کیے ہیں تاہم ابھی تک نئے ٹیرف کے مطابق بجلی کے بلوں کا اجرا نہیں کیا جاسکا ہے۔ چارٹر آف ڈیمانڈ میں شامل دیگر آٹھ مطالبات پر عملدرآمد اور مقدمات کے خاتمے کیلئے مذاکراتی سلسلہ بھی جاری ہے۔ دوسری جانب ریاست کی جانب سے اپنی رِٹ بحال کرنے اور مروجہ پالیسیوں کے خلاف عوامی جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی حکمت عملی پر بھی تیزی سے کام جاری ہے۔ اس مقصد کیلئے تمام محاذوں پر کوششیں کی جا رہی ہیں۔

سوشل میڈیا پر تحریک مخالف پراپیگنڈہ کرنے کیلئے بھاری سرمایہ کاری اور نوجوانوں کی تربیت کا عمل جاری ہے۔ سابق عسکری ملازمین کو جمع کر کے انہیں معاشرے میں ''مثبت'' رول ادا کرنے اور نوجوانوں میں کھویا ہوا ریاست کا اعتماد بحال کرنے کی کوششیں کرنے پر معمور کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح حریت کانفرنس سمیت تمام ریاست کے تنخواہ دار عناصر کو مسئلہ جموں کشمیر کے گرد جمع کر کے دوبارہ سرکاری 'تحریک آزادی' کا مصنوعی غلبہ معاشرے پر مسلط کرنے کی سرگرمیاں کی جا رہی ہیں۔ تعلیمی اداروں میں مصنوعی حب الوطنی اور مبینہ بھارتی سازشوں کے خلاف ذہن سازی کے نام پر نوجوانوں کو عوامی حقوق کی بازیابی کیلئے کی جانے والی جدوجہد سے دور کرنے کا ایک پورا سٹرکچر ڈیزائن کیا گیا ہے۔ سب سے بڑھ کر تحریک کے دوران ہنگامی طور پر سامنے آنے والی قیادت کے کچھ ہر اول حصوں کی ریاست کے مقاصد کیلئے استعمال ہونے پر رضامندی کے آثار بھی نظر آ رہے ہیں۔ اس مقصد کیلئے تحریک کو منظّم کرنے والی قوم پرست اور ترقی پسند یا انقلابی سیاسی تنظیموں کو تحریک سے باہر کرنے پر زور دیا جا رہا ہے۔ ریاستی پراپیگنڈہ میں بھی یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ تحریک تو درست تھی لیکن اس میں کچھ 'شر پسند' عناصر شامل تھے جو کوئی خفیہ ایجنڈا رکھتے تھے۔ درحقیقت جنہیں شر پسند قرار دیا جا رہا ہے وہی گزشتہ چار پانچ سال سے اس تحریک کو منظّم کرنے کیلئے گراؤنڈ پر مسلسل کام کرتے آئے ہیں۔ تحریک کے حالیہ مرحلہ میں ایک سال تک انہی عناصر نے دن رات ایک کرنے کے علاوہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر کے اس تحریک کو منظّم کیا اور سماج کی وسیع تر پرتوں تک پھیلایا۔ تاہم اب ریاست کا قیادت پر یہ زور ہے کہ اس تحریک کی وجہ سے جو مروجہ نوآبادیاتی سیاسی و معاشی ڈھانچے پر عدم اعتماد کا اظہار وسیع عوامی پرتوں میں نظر آ رہا ہے' اس کو دوبارہ اعتماد میں تبدیل کرنے کا فریضہ بھی یہی قیادت سرانجام دے اور اس مقصد کیلئے اس کا قوم پرست اور ترقی پسند جماعتوں سے فاصلہ ناگزیر ہے۔ یہاں یہ واضح رہے کہ پاکستان یا الحاق نواز سیاسی جماعتوں (بشمول پیپلز پارٹی)، جنہیں مرکزی دھارے کی جماعتیں بھی کہا جاتا ہے، کی قیادتیں اس تحریک سے نہ صرف مکمل طور پر لاتعلق رہی ہیں بلکہ تقریباً تمام ہی مرکزی دھارے کی جماعتیں حکومت کا حصہ بھی ہیں۔

یوں آنے والے دنوں میں تحریک کو بڑے چیلنجز سے نبرد آزما ہونا پڑے گا۔ ریاست کے جوابی ردانقلابی حملوں، رجعتی عناصر کے پروان چڑھائے جانے، تحریک آزادی کے نام پر ایک بار پر مسلح سرگرمیوں کے ریاستی سطح پر آغاز سمیت مختلف ایسے اقدامات کیے جاسکتے ہیں جن کے ذریعے سے تحریک کی حاصلات کو لوگوں سے چھینا جاسکے۔ ایسے میں ترقی پسند کارکنوں کے خلاف انتقامی کاروائیاں ریاست کا سب سے اہم مقصد بن کر سامنے آئے گا۔

اس تحریک نے ابتدائی طور پر بہت بڑی کامیابیاں سمیٹی ہیں۔ عوامی طاقت نے نہ صرف ریاست کو مفلوج کیا ہے بلکہ کئی روز تک اس نوآبادیاتی ڈھانچے کو ہوا میں معلق رکھا ہے۔ سارا سیاسی و سماجی منظرنامہ تبدیل ہوا ہے۔ تاہم مستقبل میں ان کامیابیوں کو حوصلہ اور طاقت بناتے ہوئے آگے کی جانب سفر اگر نہ کیا گیا تو ناگزیر طور پر ریاست ایک مرتبہ پھر سماج پر اپنی گرفت مضبوط کرتی جائے گی اور نتیجے کے طور پر تحریک کی تمام حاصلات بے معنی ہو کر رہ جائیں گی۔

آنے والے دنوں میں انقلابی قوتوں کیلئے سب سے بڑا چیلنج یہی ہوگا کہ وہ اس تحریک کے تسلسل کو جاری رکھنے اور اسے پاکستان کی دیگر مظلوم اقوام اور محنت کش طبقات کے ساتھ جوڑنے کے ساتھ ساتھ اس خطے کے لوگوں کو متبادل انقلابی نظریات سے روشناس کرانے جیسے اہم فریضے کی تکمیل کیلئے اپنی تمام تر توانائیاں صرف کریں۔ بجلی اور آٹے کی قیمتوں میں کمی سے اس خطے کے محنت کشوں کے مسائل میں کمی ضرور آئے گی۔ تاہم تمام مسائل حل نہیں ہو جائیں گے۔ جب تک یہ نظام رہے گا' ریاست اور حکمران موقع ملتے ہی پہلے سے بڑے حملے کریں گے۔ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ آگے بڑھا جائے، لوگوں کو منظّم کیا جائے اور اس سامراجی سرمایہ داری کو للکارتے ہوئے نسل انسان کے سوشلسٹ مستقبل کی جانب سفر کی جدوجہد کو تیز تر کیا جائے۔

الوداع چاچا کرامت!

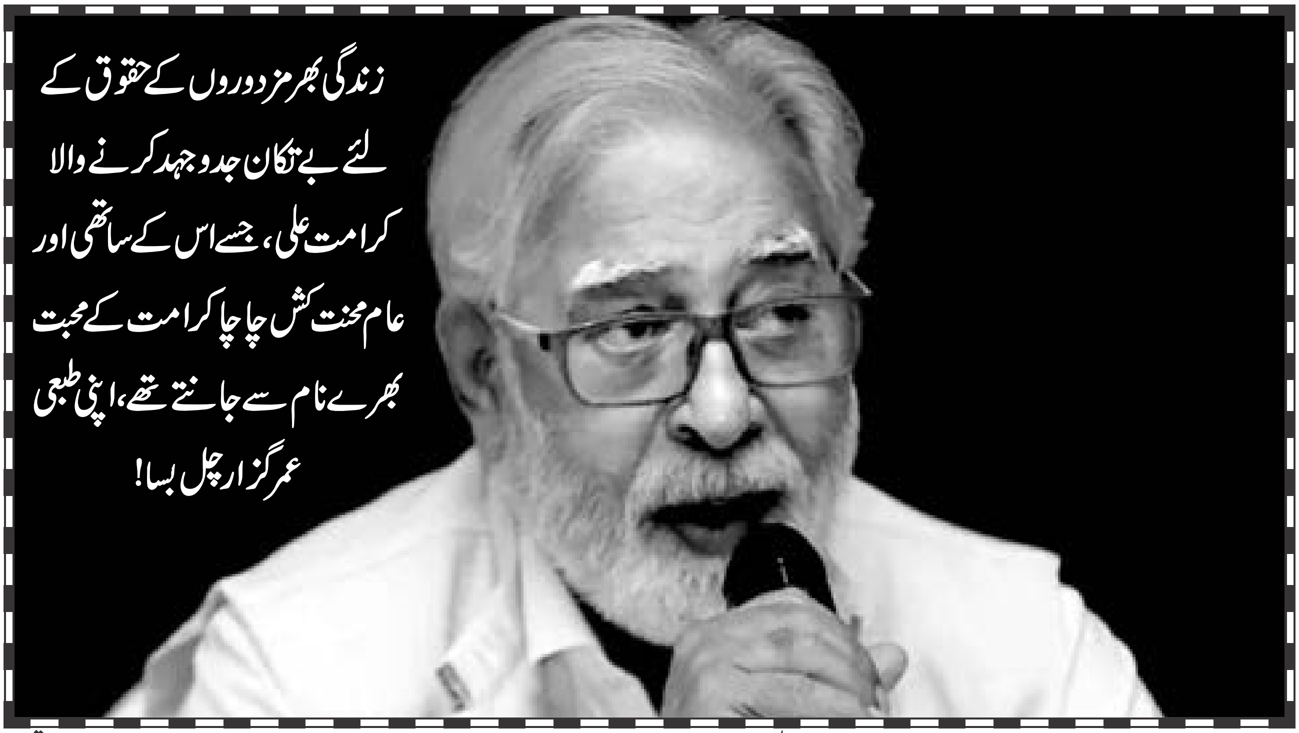

قمر الزماں خاں/عمران کامیانہ

نہ مارکسزم ختم ہوگا، نہ تاریخ ختم ہوگی... سماج کو سمجھنے کے لئے مارکسزم کا علم ہی سب سے زیادہ موزوں اوزار ہے۔ ہر استحصال زدہ انسان کو گلوبلائزیشن، سامراجی نظام اور دنیا بھر میں لاگو سرمایہ دارانہ پالیسوں کو سمجھنے اور ان سے نبرد آزما ہونے کے لئے مارکسزم کے اوزار کو بروئے کار لانا ہوگا۔ پاکستان بھر کے مزدوروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر جدوجہد کرنا ہوگی۔ بھارت، سری لنکا، پاکستان اور جنوب ایشیا بھر کے محنت کشوں کی تنظیموں اور ٹریڈ یونینوں کو مل کر جدوجہد کا لائحہ عمل بنانا ہوگا۔ جنوب ایشیا بطور خاص بھارت اور پاکستان کو ایک دوسرے کے خلاف جنگی جنون کے خاتمے اور دوستی اور امن کی طرف بڑھنا ہوگا۔ مذکورہ بالا سوچ کا مبلغ اور زندگی بھر مزدوروں کے حقوق کے لئے بے تکان جدوجہد کرنے والا کرامت علی، جسے اس کے ساتھی اور عام محنت کش چاچا کرامت کے محبت بھرے نام سے جانتے تھے، اپنی طبعی عمر گزار چل بسا!

کرامت علی 1946ء میں مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک سال کے تھے جب ہندوستان کا بٹوارہ ہوا اور خاندان ہجرت کر کے ملتان آن بسا۔ 1962ء میں ایمرسن کالج ملتان میں ہی طلبہ سیاست میں متحرک ہوئے اور جب ایوب خان نے طلبہ یونین پر قدغن لگائی تو احتجاجی تحریک میں ہراول کردار ادا کیا۔ اسی دوران جب معراج محمد خان اور سید علی مختار رضوی جیسے انقلابی طلبہ لیڈروں کو کراچی سے نکالا گیا تو کرامت علی ملتان میں ان کی پناہ کا بندوبست کرنے والے نوجوانوں میں پیش پیش تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کمشنر آفس کے سامنے احتجاجی دھرنا بھی منظّم کیا جس کے بعد کمشنر کو ان کے مطالبات تسلیم کرتے ہوئے کراچی بدر ہونے والے طلبہ کو ملتان رہنے کی اجازت دینا پڑی۔ یہ شاید ان کی زندگی کی پہلی بڑی سیاسی جدوجہد تھی۔ تعلیم کے لئے بعدازاں وہ خود کراچی چلے گئے۔ یوں زندگی بھر وہ بٹے ہی رہے۔ لیکن برصغیر کی تقسیم کو انہوں نے کبھی تسلیم نہ کیا۔ اگرچہ اس خونی تقسیم کے خاتمے کے حوالے سے وہ دونوں ریاستوں کی دوستی اور امن پر مبنی ترقی و خوشحالی کا راستہ تجویز کرتے تھے۔

اپنے والد کی طرح خود بھی ایک مزدور کے طور پر عملی زندگی شروع کی۔ ابتدائی زندگی میں ہی وہ غریب اور امیر کے فرق اور سماج کی طبقاتی تقسیم سے واقف ہو گئے تھے۔ کچھ ذاتی تجربات نے ان کے شعور پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ جن کی بنا پر انہوں نے اس ظالمانہ اور استحصالی طبقاتی تقسیم کے خاتمے کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی۔ بنگال سے لے کے بلوچستان تک انہوں نے نہ صرف طبقاتی بلکہ قومی استحصال کے خاتمے کے لئے بھی فکری اور عملی جدوجہد کی۔ خواتین کے حقوق کے علمبردار بھی ہمیشہ رہے۔ الغرض آخری وقت تک طبقاتی، قومی، صنفی حوالے سے سماج کے پسے ہوئے حصوں کے دکھ درد کو ہمیشہ اپنا سمجھا۔ اس حوالے سے وہ ظالم، چاہے وہ ریاست کے آقا ہوں، کرپٹ پارٹی قیادتیں ہوں یا رئیل اسٹیٹ کے بڑے ٹائیکون ہوں، کے سامنے ڈٹ جانے سے کبھی نہیں ڈرے۔ متعدد مرتبہ جیل گئے۔

زندگی کی شروعات سے ہی بائیں بازو کے نظریات سے متاثر ہو گئے۔ ماؤازم سے متعارف ہو کر 'نیپ' (بھاشانی) میں شامل ہوئے۔ ترقی پسند تحریکوں اور پارٹیوں میں ہراول کردار ادا کیا۔ اسی جدوجہد کے دوران جواں عمری کے وقتوں میں ماؤازم اور سٹالنزم کی مرحلہ واریت اور مصالحانہ روش سے سخت مایوس بھی ہوئے۔ پھر لیون ٹراٹسکی کی تصنیفات پڑھیں۔ اس عظیم انقلابی کے نظریات اور سٹالنزم کے خلاف اس کی لازوال جدوجہد کو جانا۔ لندن میں قیام کے دوران طارق علی اور دیگر نامور ٹراٹسکی اسٹوں سے

مل کر تنظیمی و سیاسی کام کیا۔ یہیں ان کی ملاقات کامریڈ لال خان اور ان کے ساتھیوں سے ہوئی۔ جو جلاوطنی میں جنرل ضیاالحق کی آمریت اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جدوجہد کو منظّم کرنے کی شروعات میں تھے۔ کامریڈ لال خان اور کرامت علی کی یہ ملاقات' جلد ایسی دوستی میں تبدیل ہوگئی جو زندگی بھر اٹوٹ رہی۔ کرامت علی نے ہی کامریڈ لال خان کو عظیم انقلابی کامریڈ ٹیڈ گرانٹ سے متعارف کرایا۔ جس کے بعد پاکستان، جنوب ایشیا اور دنیا بھر میں طبقاتی جدوجہد اور مارکسی تنظیم سازی کے کئی نئے راستے کھلے۔

کرامت علی نے اپنی زندگی محنت کش طبقے پر جبر و استحصال کے خاتمے کے خلاف جدوجہد میں گزاری۔ یہ درست ہے کہ اپنی زندگی کی آخری دہائیوں میں انہوں نے سماج کی تبدیلی کی نسبتاً اصلاح پسندانہ اور ارتقائی روش اختیار کی۔ لیکن دوستوں کے ساتھ بے تکلفی پر مبنی محفلوں میں وہ اس ارتقائی عمل کو انقلابی جست کا پیش خیمہ ہی قرار دیتے تھے۔ یہ سیاسی و نظریاتی نقطہ نظر اختیار کرنے کا انہیں پورا حق حاصل تھا۔ جس طرح ان کے انقلابی دوستوں نے اس سے اتفاق نہ کرنے کا حق ہمیشہ استعمال کیا۔ اس کے باوجود رشتوں میں کبھی تلخی آئی نہ چاچا کرامت نے انقلابی قوتوں کی تعمیر میں جو انتظامی و سیاسی سہولت وہ دے سکتے تھے' دینے سے کبھی انکار کیا۔

کرامت علی پاکستانی ریاست کی طفیلی ہیئت، سامراجی اطاعت گزاری اور نیولبرل پالیسیوں کی ناگزیریت کے باوجود سمجھتے تھے کہ ٹریڈ یونین کا ادارہ منظّم کر کے ہی مزدوروں کے خلاف ناانصافی اور استحصال کا مداوا ہوسکتا ہے اور آگے کی جدوجہد کی راہیں ہموار ہوسکتی ہیں۔ ان کا موقف تھا کہ پاکستان میں صنعتوں میں کام کرنے والے محنت کشوں کی بڑی تعداد ٹریڈ یونین کی تنظیم سے باہر ہے اور مزدور انجمنوں کی وسعت اور مضبوطی سے مزدوروں کے لئے اپنے حقوق حاصل کرنا آسان ہوجائے گا۔ مشرف دور کے متنازعہ آئی آر او 2010ء سمیت مزدور دشمن قانون سازی کے خلاف لڑائی میں انہوں نے ہمیشہ بھرپور کردار ادا کیا۔ اسی طرح محنت کشوں اور خواتین سمیت سماج کی کچلی ہوئی پرتوں کے حق میں قانون سازیوں کے لئے ہمیشہ لابنگ میں سرگرم رہے اور مہمات چلاتے رہے۔ ان کی کوشش ہوتی کہ اس نظام کی حدود میں قانون سازی، یونین سازی یا دوسرے بورژوا طریقہ ہائے کار سے جہاں کہیں مظلوم انسانوں کی زندگی میں بہتری کی کوئی گنجائش بنتی ہے' اسے بروئے کار لایا جائے۔ اس سلسلے میں ملک گیر ورکشاپوں، سیمیناروں اور دوسری نشستوں کا انعقاد کرواتے رہتے تھے اور اسی سلسلے میں انہوں نے 'پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف لیبر ایجوکیشن اینڈ ریسرچ' (پائلر) کی بنیاد بھی رکھی۔ مزدور تحریک، لیبر قوانین، محنت کشوں کی حالت زار وغیرہ کے حوالے سے اعداد وشمار،

سرویز اور تجزیات پر مبنی اہم مطبوعات کی لمبی فہرست ہے جو یہ ادارہ شائع کرتا رہا ہے اور جن سے سیاسی، تنظیمی اور درسی حوالوں سے مستفید ہونے والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ لیکن پھر اسی 'پائلر' کے دروازے ملک بھر کے انقلابیوں کے لئے بھی کبھی بند نہیں ہوئے۔ ان کٹھن معروضی حالات میں جہاں ایک انقلابی تنظیم کے لئے سیاسی، سماجی وثقافتی کٹھنائیوں کے ساتھ ساتھ مالی مشکلات کا بھی کوئی شمار نہیں اور اس مسلسل بڑھتی مہنگائی اور تنگی میں کوئی بڑا تنظیمی اجلاس کروانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے' چاچا کرامت کے ادارے کا سستا (بلکہ ان کے انقلابی دوستوں کے لئے تقریباً مفت) ہاسٹل، ہال اور کچن کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔ اسی طرح دنیا بھر میں اکیڈیمیا سے وابستہ مارکسی رجحانات رکھنے والے اساتذہ، جنہیں ریسرچ کے لئے پاکستان آنا پڑتا، کے لئے بھی یہ ادارہ ایک طرح کا دوسرا گھر رہا ہے۔

اگر کہا جائے کہ کراچی اور بالعموم پاکستان بھر میں چاچا کرامت مروجہ مزدور تنظیموں، یونینوں، فیڈریشنوں اور کنفیڈریشنوں کے سرپرست، تذویراتی ماہر اور نظریہ دان کا کردار نبھاتے رہے تو مبالغہ آمیزی نہیں ہوگی۔

بٹوارے میں سامراجی طاقتوں کی سوچ کے مطابق ڈیزائن کیا گیا ایک سابق نوآبادیاتی ملک، جس میں تمام تر اداروں کی ساخت اور طریقہ کار اب بھی نوآبادیاتی طرز پر ہی مبنی ہے، میں بتدریج جمہوریت اور بورژوا جمہوری اداروں کا قیام اور مزدور یا انسان دوست قوانین کی منظوری و اطلاق وغیرہ اگر یکسر ناممکن نہیں تو اس کی گنجائش انتہائی محدود ضرور ہے۔ مزید برآں نظام کے بحران کے ساتھ یہ گنجائش بھی ختم ہوتی جاتی ہے۔ مزدور دوست اصلاحات کی مانگوں اور جدوجہدوں میں مارکس وادی ان حقائق کو ہمیشہ مدنظر رکھتے ہیں۔ یوں ہمارے نزدیک چاچا کرامت کی بہت سی مہمات اور کاوشیں' خاصی غیر حقیقی شمار کی جاسکتی ہیں۔ جیسے سرمایہ دارانہ نظام اور ریاستوں کی موجودہ کیفیت کے رہتے ہوئے برصغیر میں امن، دوستی اور بھائی چارے کی کوششیں۔ یا پھر اٹھائیس لاکھ بے گناہوں کے خون سے کھینچی ہوئی سرحدوں کے ہوتے ہوئے ایٹمی اسلحے کے بغیر برصغیر کا خیال۔ چاچا کرامت نے یہ خواب بہرحال دیکھے اور یہ ان کی بڑائی تھی۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ان خوابوں کی انقلابی تعبیر کے لئے سرگرداں نوجوان انقلابیوں کی طرف ہمیشہ شفقت، رہنمائی، حوصلہ افزائی اور سہولت کا رویہ اپنایا۔ پرانی ماؤاسٹ یا سٹالنسٹ تنظیموں اور مزدور تحریکوں کی تاریخ اور اسباق کے حوالے سے وہ ایک انسائیکلوپیڈیا کا درجہ رکھتے تھے۔ مزید برآں ان کی 78 سالہ زندگی توانائی، حوصلے اور امید سے بھرپور تھی۔ صحت کی خرابی اور علالت کے آخری سالوں میں بھی نظریاتی مباحث اور سماجی و ثقافتی تبادلہ خیال پر مبنی محافل کو وہ رات گئے تک جوان رکھتے۔

گراوٹ، جبر، گھٹن اور تعفن سے بھرے اس ماحول میں ان کی وفات یقیناً ایک دردانگیز واقعہ ہے۔ ان سے تمام تر سیاسی و نظریاتی اختلافات کے باوجود ان کی کمی ہمیشہ محسوس کی جائے گی اور ان کی طویل سیاسی و تنظیمی زندگی سے سیکھتے ہوئے ایک مختلف طریقے اور انداز سے ہی سہی لیکن ان کے خوابوں کی تعبیر کی جدوجہد جاری رہے گی۔

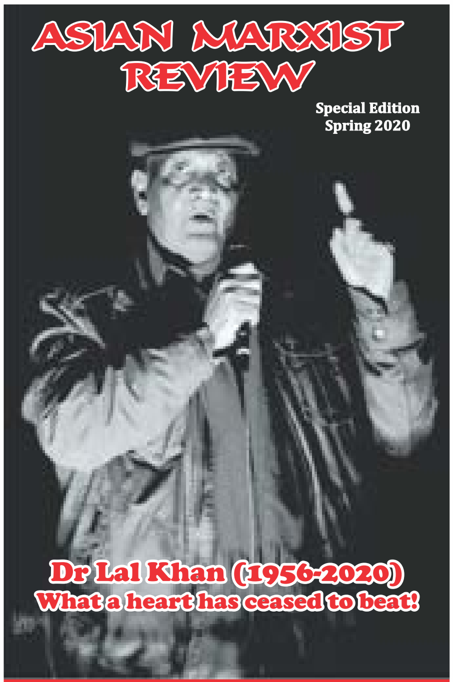

ماهوار
دنيا جا پورهيتو هڪ ٿي وڃو!
مسلسل اشاعت جا 35 سال
طبقاتي
جدوجهد
انقلابي سوشلزم جو علمبردار!

मेहनतकशों का पैग़ाम
مزدور مورچہ
मेहनतकशों के नाम
मज़दूर मोर्चा
पाक्षिक
www.mazdoormorcha.com

MAZDOOR NAMA
ایڈیٹر
قمرالزماں خاں
مزدُور نامہ
قیمت 10 روپے
پاکستان ٹریڈیونین ڈیفنس کمپئین کا ترجمان

سہ ماہی مجلّہ
عزم
جواں نسل کے انقلابی و سیاسی شعور کا ترجمان

فرانس میں بائیں بازو کے اتحاد کے ہاتھوں فار رائٹ کی شکست

بھارتی انتخابات میں ہندوتوا گھائل:
اب نہ ہم پہ چلے گا تمہارا افسوں!

Workers of the world unite

THE STRUGGLE

Vanguard of Revolutionary Socialism!

انقلابی آئین ساز اسمبلی کا قیام

آئین میں سرمایہ دارانہ نظام اور ریاستی جبر و استحصال کو جواز فراہم کرنے والی تمام شقوں کا خاتمہ۔ محنت کشوں کے حقیقی نمائندوں پر مشتمل آئین ساز اسمبلی کا قیام جو منتخب عوامی پنچائتوں کے جمہوری کنٹرول پر مبنی ایسے معاشرے کو تشکیل دے جس سے بنیادی حقوق کی فراہمی یقینی بن سکے۔

محنت کش

افراطِ زر کے ساتھ منسلک محنت کش کی تنخواہ کم از کم ایک تولہ سونے کے برابر۔ تمام بنیادی سہولتوں کی عوام کو مفت فراہمی۔ ہفتہ وار اوقاتِ کار کو 35 گھنٹے کرنا۔ ٹھیکیداری نظام اور چائلڈ لیبر کا خاتمہ۔

صنعت اور معیشت

تمام قومی اور سامراجی اثاثوں کو ضبط کر کے مزدوروں کے جمہوری کنٹرول اور انتظام میں دینا۔ نجکاری اور ڈاؤن سائزنگ کا مکمل خاتمہ۔ تمام سامراجی قرضوں اور اثاثوں کی ضبطگی۔ سامراجی جبر کے خلاف جدوجہد کو طبقاتی بنیادوں پر منظّم کرنا۔

غریب کسان

تمام جاگیروں کی مزارعوں میں تقسیم۔ اجتماعی کاشتکاری کا فروغ اور جدید ٹیکنیکی بنیادوں پر زرعی انقلاب

نوجوان

روزگار کی ضمانت یا 10,000 روپے بے روزگاری الاؤنس۔ طبقاتی نظامِ تعلیم کا خاتمہ اور تمام سطحوں پر مفت تعلیم۔ طلبہ یونین سازی پر عائد پابندی کا فی الفور خاتمہ۔ 16 سال کی عمر میں ووٹ کا حق۔

خواتین

تمام رجعتی قوانین کا خاتمہ۔ محنت کش خواتین کو تمام شعبوں میں مساوی حقوق اور نمائندگی۔ زچگی کے دوران تنخواہ سمیت 6 ماہ کی رخصت۔ گھریلو اور صنعتی محنت میں تفریق کا خاتمہ۔

مذہبی اقلیتیں

مذہبی اقلیتوں کو برابری کے حقوق۔ سماجی و ثقافتی تعصب اور جداگانہ طریق انتخاب کا خاتمہ۔ ریاست کو مذہب سے علیحدہ کرنا۔

قومی مسئلہ

مظلوم قوموں کے حق خودارادیت کا تسلیم کیئے جانا اور قومی آزادی کی تحریکوں کو طبقاتی جدوجہد سے منسلک کرتے ہوئے برصغیر کی رضاکارانہ سوشلسٹ فیڈریشن کا قیام جو تمام قومی و ثقافتی حقوق کی ضامن ہوگی۔

فوج

فوج میں کمیشن سسٹم کا خاتمہ۔ افسروں اور سپاہیوں کی تنخواہیں اور مراعات مساوی ہونا۔ تمام افسروں کا سپاہیوں کی کمیٹیوں کے ذریعے انتخاب۔ ایٹمی اور روایتی ہتھیاروں کا خاتمہ۔

خارجہ پالیسی

خارجہ پالیسی کی طبقاتی بنیادوں پر استواری۔ افغانستان سمیت دوسرے ممالک میں مداخلت اور رجعتی ملاؤں کی حمایت کا خاتمہ۔ سامراجی گماشتگی اور قومی شاونسٹ طرز کی خارجہ پالیسی کا مسترد کیئے جانا۔ محنت کشوں کو بین الاقوامی تحریک سے منسلک کرتے ہوئے عالمی سوشلزم کی جدوجہد کو تیز کرنا۔